محمد الیاس کے ناولوں میں سماجی شعور اور عصری مسائل

(بحوالہ خصوصی "کُہر" اور "حبس")

مقالہ برائے ایم (فل اردو)

مقالہ نگار:

علینہ نواز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۱ء

محمد الیاس کے ناولوں میں سماجی شعور اور عصری مسائل

(بحوالہ خصوصی "کُہر" اور "حبس")

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

علینہ نواز

یہ مقالہ

ایم فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۱ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف ہائیر لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: محمد الیاس کے ناولوں میں سماجی شعور اور عصری مسائل (بحوالہ خصوصی "کُہر" اور "حبس")

پیش کار: علینہ نواز رجسٹریشن نمبر:MP-URD-F18-23889

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اردو

ڈاکٹر رخشندہ مراد (نگرانِ مقالہ)

پروفیسر ڈاکٹر ارشد محمود

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈئر محمد ابراہیم

ڈائریکٹر جنرل

جنوری ۲۰۲۱ء

اقرار نامہ

میں علینہ نواز حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل اردو سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ مراد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

علینہ نواز

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۲۱ء

فہرستِ ابواب

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم		III
اقرار نامہ		IV
فہرست ابواب		V
مقالے کا دائرہ کار		IX
Abstract		X
اظہارِ تشکر		XI
باب اول	موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	1
الف۔	تمہید	1
۱۔	موضوع کا تعارف	۱
۲۔	بیانِ مسئلہ	۱
۳۔	مقاصدِ تحقیق	۲
۴۔	تحقیقی سوالات	۲
۵۔	نظری دائرہ کار	۲
۶۔	تحقیقی طریقہ کار	۳
۷۔	مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	۳
۸۔	تحدید	۴
۹۔	پس منظری مطالعہ	۴
۱۰۔	تحقیق کی اہمیت	۴

ب۔ سماجی شعور ۱۴

ا۔ معانی، تعریف، ادبی مفہوم

۲۔ اردو ناول میں سماجی شعور کا پس منظری مطالعہ

ج۔ محمد الیاس کی ناول نگاری

ا۔ محمد الیاس تعارف

۲۔ محمد الیاس کی ناول نگاری

د۔ حوالہ جات

باب دوم: "کُہر" میں سماجی شعور اور عصری مسائل ۴۴

الف۔ مذہبی افکار کی عمل داری اور سماج پر اثرات

ب۔ سماجی بندشیں اور طبقاتی تقسیم کے اثرات

ج۔ اخلاقی اقدار کا انحطاط

د۔ سیاسی تغیر و تبدل کے نتیجے میں سماجی اعلیٰ اقدار

حوالہ جات

باب سوم: "حبس" میں سماجی شعور اور عصری مسائل ۹۴

الف۔ مذہبی افکار کی عمل داری اور سماج پر اثرات

ب۔ سماجی بندشیں اور طبقاتی تقسیم کے اثرات

ج۔ اخلاقی اقدار کا انحطاط

د۔ سیاسی تغیر و تبدل کے نتیجے میں سماجی اعلیٰ اقدار

حوالہ جات

باب چہارم: ماحصل ۱۴۰

الف۔ مجموعی جائزہ

ب۔ نتائج

ج۔ تعینِ قدر

د۔ سفارشات

کتابیات

ضمیمہ

مقالے کا دائرہ کار

میں نے اپنی تحقیق بعنوان "محمد الیاس کے ناولوں میں سماجی شعور اور عصری مسائل" (بحوالہ خصوصی "کہُر" اور "حبس") کے لئے افسانوی نثر کا میدان منتخب کیا ہے۔ مقالے میں محمد الیاس کے ناولوں میں سماجی شعور اور اردو ادب پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں سماج اور اس سے متعلقہ مباحث شامل ہیں۔ نیز اردو ناول میں سماجی شعور ایک پس منظری مطالعہ کے ساتھ ساتھ محمد الیاس کے احوال و آثار بیان کئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں محمد الیاس کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب "کُہر" میں مذہبی افکار کی عملداری اور سماج پر اس کے اثرات، سماجی بندشیں اور طبقاتی تقسیم کے اثرات، اخلاقی اقدار کا انحطاط، سیاسی تغیر و تبدل کے نتیجے میں اعلی سماجی اقدار کا زوال اور سماجی مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔

"حبس" کے عنوان سے تیسرے باب میں مذہبی افکار کی عمل داری اور سماج پر اس کے اثرات، سماجی بندشیں اور طبقاتی تقسیم کے اثرات، اخلاقی اقدار کا انحطاط، سیاسی تغیر و تبدل کے نتیجے میں اعلی سماجی اقدار کا زوال اور سماجی مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ باب چہارم ماحصل پر مشتمل ہے جس میں مقالہ کے مباحث کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے سوالاتِ تحقیق کے نتائج مرتب کیے گئے ہیں۔ پھر ان مباحث اور نتائج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سفارشات مرتب کی گئی ہیں۔ تحقیق میں معاون کتب کی فہرست، کتابیات کے عنوان سے مرتب کی گئی ہے۔

آخر میں ناولوں کے مصنف کا انٹرویو بھی شامل کیا گیا ہے۔

Abstract

Literature is a true reflection of any society. Society is made up of diverse elements. Coherence and moderation in these elements guarantee the survival of the society. The beauty of any society lies in the presence of its diverse units. Under the ever-changing conditions, there is a change in the functioning and thinking of these units which is the cause of the evolution of society. But in practice, when the elements of society lose moderation and move towards any intellectual or practical extremism, social deterioration occurs. The reasons for which are different in every age. A good writer is a part of the society of his time and he not only exposes these causes and their motives but also helps in understanding them and shows the way to balance them. This aspect of the writer is his contemporary consciousness.

Muhammad Ilyas is one of the prominent contemporary writers of this line of writers. In their works there is a deep understanding and modern awareness of the social situation of the present age. The social problems of the modern age, whether they are the result of religious, economic, social, linguistic, regional and political conflicts, or the changing cultural values, are the subject of Muhammad Ilyas. In view of this aspect, the title of this article is "Muhammad Ilyas kay Navlon Main Samaji Shaoor Or Asri Msail". In this Thesis, we will make a critical and research study on the social consciousness and contemporary issues of Muhammad Ilyas's two selected novels "Kohr" and "Habs" on the same basis and see in his novels the understanding and presentation of the social and modern situation.

اظہارِ تشکر

عالمیان کے رب کی شکر گزار ہوں کہ جس کے عطا کردہ شعور کی بدولت مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ بلا شبہ یہ ایک کٹھن سفر تھا۔ جس میں بہت سے لوگ شریکِ سفر رہے۔ جس میں بالخصوص شعبہ اردو کے تمام اساتذہ کی شکر گزار کہ جنہوں نے فنِ تحقیق سے نا آشنا کو تحقیق کے ہنر سے شناسا کیا اور یہ تحقیقی کام اپنے کمال کو پہنچا۔ اس مقالے کی تکمیل میں نگران مقالہ ڈاکٹر رخشندہ مراد کی شکر گزار ہوں جنہوں نے ہر مرحلہ پر میری راہنمائی فرمائی اور اس مشکل مرحلہ کو آسان بنایا۔ کولیگ فہیم احمد صابری کا شکریہ ادا کرنا فرض سمجھتی ہوں جو دورانِ تحقیق پیش آنے والی مشکلات پر قدم قدم پر مدد گار رہے۔ پروفیسر جمیل حیات کی شکر گزار ہوں۔ جنھوں نے مواد کی فراہمی میں بخل سے کام نہیں لیا۔ جب بھی ان سے رابطہ کیا نہایت شفقت کا مظاہرہ کیا۔

یہ کامیابی والد محترم کے نام جنھوں نے زندگی کے ہر مشکل مرحلے پر میرا ساتھ دیا اور جن کا ہونا میری طاقت تھی۔ بھائی علی نواز کی شکر گزار ہوں جن کی مدد اور سہارے نے مجھے اس مقام پر پہنچایا۔ بھائی کی بدولت ایم فِل کے خواب کو حقیقت کا روپ ملا۔ بہنوں مشعل آپی اور نور اور ندا نے پروف ریڈنگ سے لے کر مواد کی جمع آوری تک ہر مقام پر ساتھ دیا اور میری الجھنوں کو کمال شفقت سے دور کیا۔ اپنی مخلص دوست سارا کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہو گی کہ جس نے دورانِ تحقیق میرا حوصلہ بڑھایا اور حتی المقدور ٹائپنگ میں مدد کی۔ ہم جماعت برادرم کاشف نقوی اور اعجاز رزاق کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنھوں نے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

علینہ نواز

ایم فل سکالر

باب اول

سماجی شعور، عصری مسائل، بنیادی نظری مباحث

الف۔ تمہید:

ا۔ موضوع کا تعارف

ادب کسی بھی سماج کا حقیقی عکاس ہوتا ہے۔ سماج متنوع عناصر سے مل کر بنتا ہے۔ ان عناصر میں ربط وترتیب اور اعتدال سماج کی بقاء کی ضمانت ہے۔ کسی بھی سماج کا حسن اس میں موجود متنوع اکائیوں کی موجودگی میں ہی ہے۔ نت نئے بدلتے حالات کے تحت ان اکائیوں کے افعال وافکار میں تغیر و تبدیلی ہوتی ہے جو کہ سماج کے ارتقاء کا سبب ہے۔ لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو سماج کے عناصر جب اعتدال کھو دیتے ہیں اور کسی بھی فکری یا عملی شدت پسندی کی طرف بڑھتے ہیں تو سماجی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ جس کے اسباب ہر عہد میں مختلف ہوتے ہیں۔ اچھا ادیب اپنے عہد کے سماج کا نباض ہوتا ہے اور وہ ان اسباب وعلل اور ان کے محرکات کو نہ صرف اجاگر کرتا ہے بلکہ ان کی تفہیم میں مدد اور ان کے توازن کی راہ بھی سجھاتا ہے۔ ادیب کی یہی جہت اس کا عصری شعور ہے۔

محمد الیاس معاصر ادیبوں میں ایک ممتاز نام ہے۔ جن کے فن پاروں میں عہدِ حاضر کی سماجی صورتحال کی گہری تفہیم اور عصری آگہی بدرجہ اتم موجود ہے۔ عہدِ جدید کے سماجی مسائل خواہ وہ مذہبی، معاشی، معاشرتی، لسانی، علاقائی اور سیاسی کشمکش کا نتیجہ ہوں یا بدلتی ہوئی تہذیبی و ثقافتی اقدار محمد الیاس کا موضوع ہیں۔ اس مقالے میں ہم انہی بنیادوں پر محمد الیاس کے دو منتخب ناولوں "کُہر" اور "حبس" کا سماجی شعور اور عصری مسائل کے حوالے سے تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کریں گے کہ ان ناولوں میں سماجی و عصری صورتحال کی تفہیم و پیشکش کن کن صورتوں میں ہے۔

۲۔ بیان مسئلہ

ادب کا ایک مقصد تنقید حیات بھی ہے۔ اچھا ادب سماج میں اعلیٰ اقدار کی ترویج کرتا ہے۔ جس سے معاشرے میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ عہد حاضر میں فکر انسانی کے ارتقاء اور تیزی سے بدلتی ہوئی سماجی صورتحال کے سبب بہت سے مسائل جنم لے رہے ہیں جو سماج میں عدم توازن اور بگاڑ پیدا کر رہے ہیں۔

محمد الیاس معاصر ادیب ہیں اوران کے فن پاروں میں گہرا سماجی شعوراور عصری مسائل سے آگہی پائی جاتی ہے۔ اس مقالے میں ان کے ناولوں "کہر" اور حبس" کے تنقیدی و تحقیقی مطالعے سے دیکھا جائے گا کہ ان کے ہاں سماج اور سماجی مسائل کی تفہیم کیا ہے اوراس کی پیش کش کی صورتیں کیا ہیں۔

۳۔ تحقیقی مقاصد

ا۔ محمد الیاس کے ناولوں میں سماجی شعوراور عصری مسائل کی تفہیم کرنا۔

۲۔ "کہر" اور "حبس" میں سماجی شعوراور عصری مسائل کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے سماجی شعوراور عصری مسائل کی مختلف جہات کی پیشکش کا تجزیہ کرنا۔

۳۔ محمد الیاس کے ناولوں میں سماج اور سماجی مسائل کے پس منظر میں کار فرما عوامل کا تجزیہ کرنا۔

۴۔ تحقیقی سوالات

ا۔ محمد الیاس کے ناولوں میں موجود فکر کے نمایاں اوصاف کیا ہیں؟

۲۔۔ محمد الیاس کے ناولوں میں سماج اور سماجی مسائل کے پس منظر میں کار فرما عناصر کیا ہیں۔

۳۔ محمد الیاس کے ناول "کہر" اور "حبس" سماجی شعوراور پیش کردہ عصری مسائل کی نوعیت و معنویت کیا ہے اوراس کی پیشکش کن ادبی زاویوں سے کی گئی ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار

اس مقالہ میں محمد الیاس کے دوناولوں "کہر" اور" حبس" کو سماجی شعوراور عصری مسائل کے تناظر میں دیکھتے ہوئے ان دونوں ناولوں میں سماجی شعوراور عصری مسائل کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لیا جائے گا۔

۷۔ تحقیقی طریقہ کار

بنیادی طور پر فکشن یاادب پر مقداری تحقیق ممکن نہیں ہوتی۔ کیونکہ ادب چند اعداد و شمار کا نام نہیں ہے۔ لہذا اس میں زیادہ تر کمیتی طریقہ کار اختیار کیا جائے گا۔ جس میں بنیادی ماخذ یعنی دونوں ناولوں کے متن کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا جائے گا۔ نیز مصنف کے انٹرویو کے ساتھ ساتھ ان کے فن پر لکھے گئے مقالہ جات اور مضامین سے استفادہ کیا جائے گا۔

۸۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

ایم فل

۱۔ محمد الیاس کی ناول نگاری، تحقیقی مقالہ برائے ایم فِل اردو ۲۰۱۵۔۲۰۱۳ یونی ورسٹی آف سرگودھا

۲۔ محمد الیاس کی افسانہ نگاری، تحقیقی مقالہ برائے ایم فِل اردو، ۲۰۱۶۔۲۰۱۴، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۳۔ محمد الیاس کی افسانہ نگاری: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے ایم فِل اردو، ۲۰۱۵۔ ۲۰۱۳ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

ایم اے

۱۔ محمد الیاس کی افسانہ نگاری، مقالہ برائے ایم اے اردو، ۲۰۰۶۔۲۰۰۵، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۹۔ تحدید

اس مجوزہ موضوع کے تحت محمد الیاس کے صرف دو ناولوں کو زیرِ بحث لایا جائے گا جن کے نام "کُہر"، "حبس" یہ ہیں۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت

اچھا ادیب جہاں معاشرے کی عکاسی کرتا ہے وہیں معاشرتی ارتقا کے لیے درست سمت کا تعین بھی کرتا ہے۔ اس جدید دور میں ترقی کے پیشِ نظر نہ صرف ایک دوسرے سے رابطے تیز ہوئے ہیں، بلکہ فکری اختلافات اور سیاسی و سماجی افکار کے تغیر و تبدل کے سبب معاشرتی عدم توازن پیدا ہو رہا ہے۔ جس سے سماجی مسائل جنم لے رہے ہیں۔ اس تحقیق سے جہاں اس سماجی صورتحال کے متعلق محمد الیاس کی فکر اور تفہیم اجاگر ہو گی اور وہاں اس کے ساتھ ساتھ موجودہ سماج کے مسائل کی تفہیم اور اصلاح کے پیشِ نظر معاصر ادب کے اس زاویے سے تنقیدی مطالعے پر مبنی تحقیقی سرمایہ میں بھی ایک اچھا اضافہ ہو گا۔ جو ادیب کی تفہیم اور ادبی تنقید کے عصری تقاضے ہر دو حوالے سے نہایت اہم ہے۔

ب۔ سماجی شعور:

سماجی شعور کی اصطلاح دو الفاظ کا مرکب ہے۔ 'سماج' اور 'شعور'، لہذا سماجی شعور کو سمجھنے کے لیے سماج کو سمجھنا ضروری ہے۔ سماج کی تفہیم میں یہ پہلو بھی اہمیت کا حامل ہے کہ سماج کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ سماج کے حوالے سے کون کون سی جہتیں قابلِ تفہیم ہیں۔ اس کے لیے سماج اور اس کی تشکیل کو مختلف ناقدین اور مفکرین کی آراء کی روشنی میں سمجھتے ہیں۔

ا۔ سماج

سماج افراد کے ایسے گروہ پر مشتمل ہوتا ہے جن کی زندگی کی ضروریات میں مشترکہ روابط کو بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ سماج کا تعلق ایک قوم یا ایک ہی مذہب سے ہو۔ لفظ "سماج" کو نگینہ جبین نے اپنی اصل کے اعتبار سے سنسکرت سے ماخوذ بتایا ہے۔ "سماج سنسکرت زبان کے دو لفظوں "سم" اور "اج" سے مل کر بنا ہے۔ "سم" کے معنی ہیں اکٹھا یا ایک ساتھ اور "اَج" کے معنی ہیں اکٹھا رہنا"۔[1]

سماج کو عربی میں معاشرہ کہتے ہیں جو معاشرت کے لفظ کی ایک صورت ہے۔ معاشرہ کے معنی باہم مل جل کر رہنے، ٹولی، سماج انجمن وغیرہ کے ہیں۔ اگر اصطلاحی اعتبار سے دیکھا جائے تو معاشرے کو مختلف شعبہ جات کے پیش نظر وسیع اور محدود معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں وسیع معنوں میں تمام نسلِ انسانی کو سوسائٹی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور محدود معنوں میں اس سے مراد وہ گروہ ہے جو چند لوگوں یا خاندان پر مشتمل ہو۔ مختلف اردو انگریزی لغات میں سماج کے معنی بیان کیے گئے ہیں۔ وارث سرہندی علمی اردو جامع میں سماج کے معنی یوں تحریر کرتے ہیں:

> "سماج، سوسائٹی، اجتماعی زندگی جس میں ہر فرد کو رہنے سہنے، اپنی ترقی و بہبود کے لیے دوسروں سے واسطہ پڑتا ہے۔"[2]

فیروز اللغات میں الحاج فیروز الدین نے سماج کے معنی "(س۔ اج) (س امث مذ) مذکر سوسائٹی، انجمن، کمیٹی محفل، گروہ، جتھا، ٹولی، منڈلی"[3] درج کیے ہیں۔ اسی طرح دی سوشل سائنس انسائیکلوپیڈیا میں سماج کی تعریف یوں درج کی گئی ہے:

"Society is regarded as a social environment comprising the aggregate total of people in so far as they influence and frame this or that person's behaviour".[۴]

اس تعریف کو دیکھا جائے تو معاشرہ بنیادی طور پر افراد کے مجموعی تعاملات کا نام ہے۔ افراد کیسے مجموعی طور پر دیگر افراد کے ساتھ تعلقات میں اثر قبول کرتے یا اثر ڈالتے ہیں۔ انہی تعلقات کے مجموعے کو سماج یا معاشرہ کہتے ہیں۔

آکسفورڈ ایڈوانس لرنر لغت میں سماج کے معنی یوں درج ہیں:

(1) People in general living together in communities

(2) A particular community of people who share the same customs law etc. [۵]

یہاں معاشرہ کی دو تعریفیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی تعریف کا تعلق شعور سے زیادہ فطرت سے ہے۔ جس طرح دیگر تمام انواع کی خاص آبادی ایک جگہ پہ مقیم ہوتی ہے ایسے ہی انسان بطور نوع ایک جگہ آباد ہوں تو سماج کہلاتا ہے۔

سماج کی دوسری تعریف شعوری سطح کی ہے۔ کہ انسانوں کا وہ گروہ جو فطری تعاون کے علاوہ خاص اقدار کے اشتراک کی وجہ سے آپس میں جڑا ہو سماج کہلاتا ہے۔ اس شعوری سطح کے تعلق کے پیشِ نظر ماہرِ عمرانیات سپنسر ہربرٹ نے معاشرہ کی تعریف درج ذیل الفاظ میں کی ہے۔

"Society is an entity because though formed of discreet units, a certain concreteness in the aggregate of them is implied by the general persistence of the arrangements among them throughout the area occupied" [۶]

سماج مختلف شعوری اکائیوں کی موجودگی کے باوجود ایک خاص خطے پر موجود لوگوں کے درمیان ایک ربط کا نظام ہے جو ایک مجموعی اور یکساں شعوری تنظیم کی صورت میں وجود میں آتا ہے۔ اس شعور کا تعلق عمومی تنظیم سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی "کشاف تنقیدی اصطلاحات" میں رقمطراز ہیں:

"سماجی تعلقات کا وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے۔"[۷]

گویا سماج انسانی تعلقات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان تعلقات میں معاشرتی، اخلاقی، روحانی، تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی تعلقات شامل ہیں۔ اپنی ضرورتوں کے لیے انسان ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ کئی ادارے تشکیل دیتے ہیں۔ ان اداروں کا مجموعہ معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ نگینہ جبین میکاوَر کے حوالہ سے اس کی تعریف یوں نقل کرتی ہیں۔

"سماج رسم ورواج کا، حقائق اور آپس کی ہمدردی کا، مختلف گروہوں اور شعبوں کا، انسانی برتاؤ اور طور طریقوں کا حریت اور مساوات کا نام ہے"۔[۸]

درج بالا تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ سماج اور اس کے متعلقات ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔ ایک سماج کے اندر بہت سی اکائیاں ہوتی ہیں، اور یہ اکائیاں مل کر ایک کُل کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، اور پھر کُل ایک سماج بن جاتا ہے۔ جب تک اس کُل کی تمام اکائیاں اپنے اپنے حصے کا کام نہ کر رہی ہوں سماج تعمیر وترقی کی منزلوں کی جانب بہت سست روی کے ساتھ قدم بڑھاتا ہے۔ اس کی مثال ایک مشین کی صورت میں دی جا سکتی ہے۔ جس طرح ایک مشین کے بہت سے کل پرزے ہوتے ہیں، وہ کل پُرزے دراصل اس مشین کی اکائیاں کہلاتے ہیں۔ جب تک پُرزے درست حالت میں اپنا اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں تب تک مشین کارآمد اور فائدہ مند ہوتی ہے۔ اگر اس مشین کا ایک پُرزہ بھی ناکارہ ہو جائے تو مشین چلنا بند ہو جاتی ہے، یا پھر اس کی رفتار سست روی کا شکار ہو جاتی ہے۔ بعینہ سماج بھی انہی خطوط پر استوار ہوتا ہے۔ اگر سماج کے اندر صرف ظالم لوگ رہ جائیں یا ان کی تعداد کثیر ہو جائے تو انصاف اور ہمدردی کی عدم موجودگی کی وجہ سے معاشرے میں عدم توازن پیدا ہو جائے گا۔

ارسطو کے نزدیک "انسان معاشرتی حیوان ہے"۔ مل جل کر رہنا اس کی فطرت میں شامل ہے۔ اس فطرت کا اظہار کبھی قبیلے، گاؤں، شہر، ملک اور کبھی سلطنت کی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی مل جل کر رہنے سے معاشرے وجود میں آتے ہیں۔ معاشرت انسان کی فطری ضرورت ہے۔ اللہ رب العزت نے انسان کو محض فرد کی حیثیت سے نہیں پیدا کیا بلکہ اجتماعی زندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس اجتماعی زندگی میں مختلف قسم

کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اس اجتماعیت کی بنیاد باہمی تعاون اور تعلق کی مستقل بنیادوں پر قائم ہے۔ محمد حسن لکھتے ہیں کہ

"سماج بذات خود ایک عظیم اور وسیع ادارہ ہے اور اس کے اتنے رنگا رنگ روپ ہیں کہ ان میں وحدت پانا مشکل ہے"۔[9]

اس تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ سماج ایک جسیم ادارہ ہے۔ جس کے صدہا رنگ ہیں، اور ہر رنگ اپنے اندر ایک کائنات رکھتا ہے۔ اس میں جب رسوم ورواج کی بات ہوگی تو طرح طرح کے رسم ورواج سے متعارف ہونگے۔ اور ممکن ہے کہ رسم ورواج میں اتنی رنگا رنگی مل جائے کہ اس کو بیان کرنے کے لیے ہزاروں لفظ صرف ہو جائیں۔ اسی طرح جب ایک سماج کے مذہبی رنگ کی بات کی جائے تو عین ممکن ہے کہ اس مذہب کے اعتقادات اس کے ماننے والوں کی توہم پرستی، مذہب کی اصطلاحات ولفاظی، عبادات، اعمال اتنے منطقوں میں تقسیم ہوں کہ مشاہدہ کرنے والا دنگ رہ جائے۔ مذہب دراصل کسی بھی سماج کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ ایک سماج کے رہنے والے اپنے مذہب کے لئے تن، من، دھن تک داؤ پر لگا سکتے ہیں۔ اس طرح ان کا اپنا ایک علحیدہ رنگ ہوتا ہے۔ بھلے سماج ایک ادارے کی صورت میں کام کرے، لیکن اس کا ہر ادارہ اپنے جلو میں نامعلوم کتنے رنگ لے کر آگے بڑھ رہا ہوتا ہے۔

علمِ معاشرت کو انگریزی میں سوشیالوجی کہا جاتا ہے اس کا ایک نام علمِ عمرانیات بھی ہے۔ اس مضمون کے ذریعے معاشرتی کرداروں اور معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمرانیات کا تعلق ان تمام موضوعات سے ہے، جو معاشرتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابنِ خلدون نے سب سے پہلے علمِ معاشرت کی بنیاد رکھی۔ دراصل معاشرہ یا سماج ایک کثیر الجہتی نظام ہوتا ہے۔ جس میں ہر بود وباش اور ہر مذہب اور نسل ہر رنگ کے انسان بھی ہوسکتے ہیں اور کبھی ایک ہی رنگ ونسل لیکن مختلف مزاجوں کا امتزاج بھی ہو سکتا ہے۔ مشہور مسلمان مفکر مورخ اور ماہر عمرانیات ابن خلدون معاشرے کو ایک نامیاتی جسم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان کے مطابق معاشرے کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ معاشرہ بچپن جوانی اور بڑھاپے کی باقاعدہ منازل طے کرتا ہے۔ اسی دوران مختلف حالات وواقعات سے متاثر ہوتا ہے اور عروج سے زوال کی طرف جاکر اپنی طبعی موت مر جاتا ہے۔ بلاشُبہ ابنِ خلدون نے معاشرے کی مختلف صورتوں کی وضاحت کی ہے۔ وہ اس بات کی تائید بھی کرتا ہے کہ معاشرتی اعمال کے بغیر معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔[10]

افراد کے مجموعے کا نام سماج ہے۔ فرد سماج کی بنیادی اکائی ہے۔ سماج اور افراد ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ سماجی ترقی فرد کی بدولت ہوتی ہے کیونکہ افراد کی بدولت سماجی رشتے جنم لیتے ہیں۔ یہ رشتے کئی طرح کے ہوسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر علمی وادبی، گھریلو، سیاسی اور معاشرتی وغیرہ۔ یہ مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔ یہی رشتے سماج کی تشکیل میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم سماج کے تشکیلی عناصر کے حوالے سے ماہرینِ عمرانیات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اکثریت بلحاظ تعداد دو عناصر پر اتفاق کرتی ہے۔ علاقہ اور نسل۔ اس حوالے سپنسر کی درج ذیل تعریفیں قابلِ غور ہیں۔

1. "Any number of people associated together Geographically, racially or otherwise with collective interests"
2. A relatively independent or self-sufficient population characterized by internal organization, territorial, cultural distinctiveness and sexual recruitments.[11]

۳. مندرجہ بالا تعریفوں میں بالترتیب زمین، نسل اور ثقافت کو معاشرے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ گویا زمین، نسل اور ثقافت معاشرے کے تشکیلی عناصر کا اہم جزو ہیں۔ انسانی معاشرے کی تشکیل میں جن عوامل کا کردار اہم ہوسکتا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ جغرافیہ ۲۔ خاندان ۳۔ نسل ۴۔ ہم جنسی کا احساس ۵۔ خوف
۶۔ پیشہ ورانہ رشتہ ۷۔ زبان ۸۔ مذہب ۹۔ سیاست و قانون[12]

معاشرہ اکائی نہیں بلکہ اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی معاشرہ یک سطحی ہو کیونکہ ایک معاشرہ بہت سے تشکیلی عناصر سے وجود میں آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کسی معاشرے کی ثقافت نہ صرف اس کی جڑوں کا پتا دیتی ہے بلکہ اس کے مستقبل کے لائحہ عمل کو بھی طے کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک معاشرہ صحرائی ہے تو یقینی طور پر افراد معاشرہ کا رہن سہن، بود وباش، زندگی بسر کرنے کے نظریات، خوشیاں اور غم تہوار وغیرہ سبھی کا تعلق صحرا کے ساتھ اٹوٹ ہوگا اور صحرا میں اگنے والی نباتات کا دارومدار بارشوں کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ بارشیں وقت پر ہوتی رہیں گی تو اس صحرائی معاشرے کی رگوں میں خون رواں رہے گا۔ بصورت دیگر شکست وریخت اس معاشرے کا مستقبل بن جائے گی۔

ایسے میں جب ہم زمینی حوالے سے یا جغرافیائی سیاق وسباق میں ایک معاشرے کی جانچ کرتے ہیں تو زمین کی زرخیزی کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہوتی ہے۔ ایسے معاشرے یا ایسے خطے جن کی زمینیں زرخیز ہوتی ہیں۔ وہاں پر عام طور پر امن ماحول پایا جاتا ہے لوگ محنتی اور کھلے دل ودماغ کے ہوتے ہیں۔ چونکہ ان علاقوں میں فصلوں اور پیداوار کی بہتات کے ہونے کی وجہ سے ان خطوں کے باسیوں کے تہوار اور خوشیاں وغموں کا تعلق موسموں کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی آسمانی آفت نازل نہ ہو جائے تو یہ معاشرہ ترقی کرتے رہتے ہیں۔ بصورتِ دیگر شکست وریخت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

اسی طرح دنیا میں ایسے ممالک بھی موجود ہیں۔ جہاں ان کی ترقی کے لئے معدنیات زیرزمین تیل وگیس کے ذخائر بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ معاشرے عام طور پر سرمایہ دارانہ نظام کو پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ان معاشروں میں دولت کی ریل پیل ہوتی ہے۔ جہاں پر طبقاتی تقسیم کچھ زیادہ واضح بھی ہو جاتی ہے۔ اب اگر مثال کے طور پر زیرِ زمین دفینے یا معدنیات میں کمی واقع ہو جائے یا ان کا خاتمہ ہو جائے تو یہ معاشرے برباد ہیں۔ کیوں کہ ان معاشروں کے افراد زیادہ تر محنتی نہیں ہوتے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ معنی خیز ہے کہ اب اکیسویں صدی میں معاشروں کی تعمیر وترقی کا زیادہ تر انحصار صنعتوں پر ہوتا جارہا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ دنیا کو گلوبل ویلیج کہا جانے لگا ہے، کیوں کہ تمام معاشروں کی تعمیر وترقی مشینی دور کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ یوں معاشروں کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق باہمی مطابقت ویگانگت، برآمدات اور درآمدات کا توازن اور اس کے متعلقات بھی معاشرتی تشکیلی عناصر میں شامل ہو گئے ہیں۔ گویا اگر آج کسی معاشرے کی خارجہ پالیسی یا دیگر پالیسیوں میں کوئی خامی یا کمی موجود ہے تو وہاں پر بھی بگاڑ کی صورت نمایاں ہو جاتی ہے اور معاشرہ دنیا کے دیگر معاشروں سے پیچھے رہ جاتا ہے۔

اکیسویں صدی صنعت وحرفت اور سائنس کی صدی ہے۔ معاشرے کے تشکیلی عناصر میں یا دوسرے الفاظ میں جدید معاشرتی اقدار میں سائنس کا عمل دخل بہت بڑھ گیا ہے، بلکہ اسے اب معاشرے کے تشکیلی عناصر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جن خطوں میں افرادِ معاشرہ سائنس میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تو وہ صنعت وحرفت میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بھی معاشرے کی تعمیر وترقی جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔ جب ہم برصغیر کے معاشرے کی بات کرتے ہیں تو یہاں معاشرے کے تشکیلی عناصر میں زمین کی زرخیزی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح معاشرے کے تشکیلی عناصر میں ایک اہم عنصر مذہب ہے کیونکہ مذہب کے عنصر کے بغیر کوئی معاشرہ تشکیل پا ہی نہیں سکتا اور جہاں پر مذہب ہو گا وہاں پر مذہبی تعلیمات کی تشریح پر اختلافات

بھی پائے جاتے ہیں۔ مختلف افراد کے مختلف نظریات ہوں گے۔ مختلف مکتبہ ہائے نظر ہوں گے اور اسی بنا پر تعصبات پیدا ہوں گے۔ اگر تعصبات اختلاف رائے تک محدود رہیں تو معاشرہ ترقی کرتا ہے۔ اسے ذہنی اور روحانی غذا فراہم ہوتی ہے۔ بصورت دیگر مذہبی تعصبات، تنگ نظری اور تشدد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ معاشرے کے اندر عدم مساوات پھیل جاتی ہے۔ بعض اوقات تعصبات معاشرے کا خون بھی پینے لگتے ہیں۔ جیسے وطن عزیز میں گزشتہ دو تین دہائیوں میں ہوتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے بھی معاشرہ ترقی سے تہی رہ جاتا ہے تو گویا آج ہم مجبور ہیں کہ تعصبات کو بھی معاشرے کے تشکیلی عناصر میں شامل کر لیں۔

اسی طرح سیاست و قانون کسی بھی سماج کے اندر انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان میں بگاڑ آنے کی صورت میں سماج کے اندر بڑی سطح پر بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ سیاست اور سیاسی اداروں میں اگر عدل و انصاف اور قانون کی فرمانروائی ہو تو معاشرہ سنہری اقدار کی صورت میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جس وقت سیاست کے چلن بدل جائیں تب معاشرے کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے سماج متوازن راہ پر نہیں چل سکتا کیونکہ سیاست کے ایوانوں میں قانون بنتے ہیں اور عدل کے ایوانوں میں ان قوانین کی نا صرف تشریح و تفہیم ہوتی ہے بلکہ اسے فضیلت کی سند بھی مل جاتی ہے۔ گویا قوانین اور ان کے تحت عدل و انصاف کا انحصار سیاست کے ایوانوں پر ہوتا ہے۔ اگر کسی معاشرے کے سیاست کے ایوان درست سمت کا تعین نہ کر پائیں یا پھر مفاد پرستی، خود غرضی، لالچ اور ہوس کے ہاتھوں میں کھیلنا شروع کر دیں تو سماج کی تصویر بگڑ کر رہ جاتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی سماج کے بنیادی عناصر کی نوعیت اس کی تعمیر یا تخریب اور عروج یا زوال کا تعین کرتی ہے۔ سماج کی اساس، تشکیل و تعمیر اور ترقی و تنزلی کے عناصر کی تفہیم و توضیح سماجی شعور کو جنم دیتی ہے۔

۲۔ سماجی شعور

ایک ایسا نظام جو ضابطوں اور قاعدوں کے بغیر نہیں چل سکتا معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے۔ شعور عربی زبان کا لفظ ہے۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی عقل، تمیز، پہچان اور دانائی وغیرہ کے ہیں۔ شعور کے معنی لغات میں یوں درج ہیں۔ انگریزی آکسفورڈ لیونگ لغت میں درج ہے:

"Awareness:

1- Knowledge or perception of a situation or fact.

2- Concern about and well information interest in a particular situation or development."[۱۳]

شعور کے درج بالا معنی ذہن میں رکھتے ہوئے اگر سماجی شعور کی تفہیم کی جائے تو بنیادی طور پر سماج، اس کی بنت اور اس کی مختلف اقدار کے پیشِ نظر وہ شعوری فکر جو کسی بھی سماج کی ضرورت، اس کے مسائل اور ان کے حل کے متعلق کوئی واضح صورت اختیار کرے سماجی شعور کے ضمن میں آئے گی، کیونکہ سماج کی تفہیم میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر سماج مختلف اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ اکائیاں فطری انداز میں بڑھ کر آہستہ آہستہ طبقاتی اور تعصباتی ہوتی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی قومی انگریزی لغت میں شعور کے معنی لکھتے ہیں "خبر داری، ہوشیاری، واقفیت، آگاہی "[۱۴] فیروز اللغات میں الحاج فیروز الدین نے شعور کے معنی یوں درج کیے ہیں "شعور: عقل، سلیقہ، تمیز پہچان سمجھ عقل دانش"[۱۵]۔ سید احمد دہلوی نے فرہنگِ آصفیہ میں شعور کے معنی کی وضاحت یوں کی ہے "دانائی واقفیت شناخت تمیز پہچان، سمجھ، عقل، گیان، دانش[۱۶]

شعور کے درج بالا معنی ذہن میں رکھتے ہوئے اگر سماجی شعور کی تفہیم کی جائے تو بنیادی طور پر سماج، اس کی بنت اور اس کی مختلف اقدار کے پیشِ نظر وہ شعوری فکر جو کسی بھی سماج کی ضرورت، اس کے مسائل اور ان کے حل کے متعلق کوئی واضح صورت اختیار کرے سماجی شعور کے ضمن میں آئے گی، کیونکہ سماج کی تفہیم میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر سماج مختلف اکائیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ اکائیاں فطرت سے بڑھ آہستہ آہستہ طبقاتی اور تعصباتی ہوتی جاتی ہیں۔ اس ارتقائی سفر کو نگینیہ جبین نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

> سماج کا جب وجود ہوا تو اس وقت طبقات کا کوئی تصور انسانی ذہن میں نہیں تھا۔ مگر جیسے جیسے انسانی سماج کا دائرہ وسیع ہوتا گیا انسان نے مختلف کام شروع کیے نیز کاشت کاری، ماہی گیری، باغبانی، مویشی پالنا، گھر بنانا، اوزار بنانا، چمڑے کا کام جڑی بوٹیوں سے علاج اور طرح طرح کے کام شروع کیے۔۔۔ بعد میں کام کی مختلف قسموں کو سماج میں انسان کو عزت و احترام بخشنے کا ذریعہ بنایا گیا۔[۱۷]

دراصل ایک سماج کے اندر مختلف ادارے مختلف طرح کا شعور رکھتے ہیں۔ یہ اختلاف کے دھارے بہر حال کہیں نہ کہیں یکجا بھی ہوتے ہیں اور اسی یکجائی کے نتیجے میں سماجی شعور کا جنم ہوتا ہے۔

سماجی شعور کی تعریف کرتے ہوئے Stanislaw Ossowski نے لکھا۔

> The ideas that characterize Certain milieux, for the concepts, images, beliefs and evaluations that are more or less common to people of a certain social Environment and which are reinforced in the consciousness of Particular individuals by mutual suggestion and by the conviction. That they are shared by other people in the same group. This latter consideration means that the expression 'in the social consciousness' has a richer connotation than the expression 'in the consciousness of the individuals who belong to a particular group" [۱۸]

اس تعریف کو پیشِ نظر رکھا جائے تو سماجی شعور سے مراد سماج کی وہ تفہیم یا سماجی امور و تنظیم کے متعلق ایسے نظریات، عقائد اور اعمال کا فکری نظام ہے کہ جو اس سماج کے لوگوں میں مجموعی طور پر پسندیدہ ہے یا پھر ان اعمال و افعال اور نظریات و افکار کی ناپسندیدگی کا شعور ہے کہ جو سماج میں مجموعی طور پر برے خیال کیے جائیں۔ یہ شعور انفرادی شعور سے اس لیے الگ ہے کہ انفرادی شعور میں صرف فرد کی پسند و ناپسند اور معیار کے پیشِ نظر اشیاء کی تفہیم ہوتی ہے۔ لیکن سماجی شعور میں کسی بھی فرد کی وہ شعوری سطح ہے کہ جہاں وہ کسی سماج کی مجموعی فکر کو سمجھنے لگتا ہے۔

اس تفہیم سے مراد یہ ہے کہ سماج میں ہونے والے اعمال و افعال اور اس میں رائج اقدار کس حد تک اس سماج کو بنانے والی تمام اکائیوں کی مجموعی اور مشترکہ فکر سے میل کھاتے یا مختلف ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے کسی فرد کا سماج کے متعلق مکمل طور پر آگاہ ہونا ہے۔ چونکہ سماج میں مختلف شعور اور فکری نظام آپس میں مربوط ہوتے ہیں۔ اس ربط کے پیشِ نظر کچھ ایسے معیارات معاشرے میں قائم ہو جاتے ہیں کہ جن کے مطابق عمل سماج کو متوازن اور ان سے انحراف سماج کو تخریب کا شکار کر دیتا ہے۔ گویا سماجی شعور اسی معتدل فکر کی تفہیم ہے جو سماج میں ہر شعبے اور ہر طبقے میں پائے جانے والے یکساں اقداری نظام کو قائم رکھے۔

سماج کی تفہیم سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سماج مختلف اکائیوں سے مل کر بنا ہے اور اس کے مختلف شعبے ہیں۔ اس رو سے سماجی شعور بھی متنوع جہات رکھتا ہے۔ اس کا مقصد ایک متوازن سماج کا عکس پیش کرنا

ہے۔ ایک ایسا سماج جو انسانوں کی فلاح کا سبب ہو۔ یہ شعور سماج میں تنوع کے پیشِ نظر متنوع پہلو رکھتا ہے جیسا کہ J. M. Bochenski نے لکھا

> Social consciousness is a reflection of the social being of men.Depending on which aspect of social being is reflected and on the type of reflection, social consciousness is divided into specific forms of consciousness (ideological forms): social theories and views (including political and juridical ideology), religion, philosophy, science, art, morality (ethics).[۱۹]

یہاں ہم دیکھیں تو Bochenski نے ہر شعبے کے متعلق سماجی شعور کی الگ الگ کیفیات بھی بیان کر دی ہیں۔ سماج میں مذہبی، سماجی، معاشی، اقتصادی، فکری اور سیاسی طور پر بہت سے نظریات موجود ہوتے ہیں اور ان سب کے باہمی تعاملات سے ہر شعبے میں ایک مشترکہ معیار قائم ہوتا ہے۔ یہ معیار معاشرے کو متوازن رکھتا ہے۔ اسی توازن کے سبب معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ گویا سماجی شعور سماج کے اسی متوازن اور مشترک معیارات کی تفہیم اور ان پر عصری سماجی رویوں کی تنقید و تعبیر ہے۔ کوئی بھی ادیب جتنا ان سماجی رویوں کو سماج کی تشکیل اور بنت کے اعتبار سے درست اور حقیقت کے قریب ترین صورت میں اجاگر کرے گا اس کا سماجی شعور اتنا ہی گہرا ہے۔

سماجی شعور کے حوالے سے درج بالا تعریفوں یہ اخذ ہوتا ہے کہ سماجی شعور اگرچہ مختلف دائروں سے عبارت ہے، لیکن وہ تمام دائرے ایک جسیم دائرے کے اندر جذب ہو جاتے ہیں۔ جسے سماجی شعور کا نام دیا جاتا ہے۔ شعور کے یہ دائرے مختلف ناموں سے پہچانے جاتے ہیں، کہیں ان کو عقل، کسی دائرے کو سلیقہ مندی اور کسی کو دانش و حکمت کہا جاتا ہے۔ ایک بڑا دائرہ جسے سماجی شعور کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں موجود تمام دائروں کا شعور صدیوں کی فکر کا نچوڑ ہوتا ہے۔ یہ ایسے دائرے ہیں جس میں ہر سطح، ہر عمر، ہر جنس اور سماج کی ہر اکائی کا شعور اپنی جگہ موجود ہوتا ہے۔ انفرادی شعور کی نسبت سماجی شعور سے کیا مراد ہے اس ضمن میں Cooley لکھتے ہیں۔

Social Consciousness or awareness of society, is inseparable from self -consciousness, because we can hardly think of ourselves excepting with reference to a social group of some sort, nor of the group except with reference to ourselves.the two things go together, and what we realy aware of is more or less complex personal or social whole, of wich now the particular, now the genral aspect is emphasized.

In general,then, most of our reflective consciousness-of our wide-awake state of mind -is social consciousness, because a sense of our relation to other persons, or of other persons to one another, can hardly fail to be part of it. Self and society are twin-born, and we know one as immediately as we know the other.[۲۰]

یہ شعور کی مختلف سطحیں ہیں جو سماجی شعور میں شامل ہو کر اکائی کے دریا کو کل کے سمندر میں شامل کر دیتی ہیں، یوں سماجی شعور سماج کی حکمت و دانش کی پہچان بن جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ سماجی شعور کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے جو بعض اوقات ضرب الامثال، لوک کہانیوں، علاقائی ادبیات کی صورت ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی ہے اجتماعی شعور یا سماجی شعور ضروری نہیں ہے کہ لفظوں کی صورت میں ہی ہوں بلکہ یہ سینہ بہ سینہ بھی سفر کرتا ہے۔ کسی معاشرے کے بڑے بوڑھے اپنے عہد کے بہت بڑے دانشمند بھی ہوتے ہیں اسی لیے ایک زمانے میں چوپال سجتے تھے اور نوجوان بڑے بوڑھوں کے پاس بیٹھ کر دانشمندی کی باتیں سنایا کرتے تھے تھے۔

سماجی شعور کی ارتقا کی ایک صورت داستان گوئی بھی ہے۔ کسی بھی سماج کی داستانیں عہد بہ عہد راسخ ہوتے ہوئے سماجی شعور کی داستان بھی ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ سماجی شعور گویا ایک احساس کا نام بھی ہے۔ جب ایک فرد کوئی قدم اٹھانا چاہتا ہے یا کوئی فیصلہ کرنے کی نیت کرتا ہے تو اس وقت اس کی نظر میں سماجی شعور کارفرما ہوتا ہے، کیونکہ فیصلے کی گھڑی مذکورہ شخص اپنے باپ دادا اپنے احباب اور اپنے

معاشرے کے چلن کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے فیصلہ کرتا ہے۔ یہی دانشمندی یا شعور مندی اسے سماج سے عطا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں صالحہ زریں لکھتی ہیں۔

> انسان میں خود اعتمادی سماج ہی سے جنم لیتی ہے۔ گھر میں سیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ باہر سے بھی اپنے ساتھیوں سے ہیت کچھ سیکھتا ہے۔ اور آخری لمحے تک وہ سماج پر ہی زندہ رہتا ہے۔۔۔ انسان اچھا برا برتاؤ اور وہ تمام باتیں جو ہماری تہذیب میں سب اسی سماج کی وراثت ہیں۔ یہی فرق ہمیں جانوروں سے انسان بناتا ہے۔[۲۱]

سماجی شعور کی وجہ سے معاشرے ترقی کرتے ہیں اوران میں سلجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اگر سماج میں کسی مقام پر کوئی ٹیڑھ پن پیدا ہو رہا ہو تو اجتماعی شعور یا سماجی شعور اسے درست کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معاشرہ کی اصلاح کے اس پہلو کے پیچھے ادیب کا سماجی شعور کار فرما ہوتا ہے۔ وہ انفرادی سطح پر ہوتے ہوئے اجتماعی شعور کا حصہ بنتا ہے اور اس کے تناظر میں معاشرے کی تنقید کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ اس شعور کی وسعت اور گہرائی اس کی حسیت سے جڑی ہوتی ہے۔ محمد حسن لکھتے ہیں۔

> ہر فرد معاشرے کا وسیلہء اظہار ہے۔ اور ہر شاعر اور ادیب کی نجی حسیت وسیع تر اجتماعی حسیت کا حصہ بھی ہے اور اس کی نمائندہ بھی اور انفرادی حسیت ہی نہیں انفرادی زندگی اور انفرادی رویوں کا مطالعہ بھی پورے سماج کے مطالعے پر محیط ہے۔[۲۲]

اسی طرح لباس، خوراک، فنِ تعمیر نیز بول چال، رکھ رکھاؤ وغیرہ کا انحصار اجتماعی شعور پر ہوتا ہے۔ یہی سماجی شعور ہے۔ سماجی شعور کسی بھی معاشرے کی ترقی، فلاح اور انسانی رویوں کا عکاس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی شعور سماج کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا اور سماج مختلف اکائیوں کے اجتماع کا نام ہوتا ہے۔ اگر یہ اکائیاں موجود نہ ہوں تو سماج کی تشکیل ممکن نہیں ہو گی اور اگر سماج کی تہذیب و تربیت درست خطوط پر استوار نہیں ہو گی تو ایسے میں سماجی شعور کی تفہیم مشکل ہو جائے گی۔

۳۔ سماج اور ادب کا باہمی تعلق

ادب اور سماج کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ ادب سماج سے جنم لیتا ہے اور ہمیشہ سے اس کا ترجمان رہا ہے۔ اسی طرح ادب شعوری اور غیر شعوری طور پر زندگی کی حقیقتوں کا عکاس ہوتا ہے۔ ادب اور سماج ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں سماج کی حقیقتیں اس کے ضابطے اور اس کی روزمرہ تاریخ ادب

کی صورت میں آئندہ زمانوں کے لئے محفوظ ہو جاتی ہے۔ ادب سماج سے پھوٹتا ہے۔ اگر موسیقی، فنون لطیفہ وغیرہ کو بھی ادب کے متعلقات میں شامل کر لیں تو ہم یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ سماج بھی ادب سے نمو پاتا ہے۔ دونوں کی بقا کا انحصار ایک دوسرے پر ہوتا ہے۔ جب ہم شکسپیر کے زمانے کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں شیکسپیئر کے عہد میں ادب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سے جب ہم لکھنو میں رضی الدین حیدر کے عہد کی تاریخ پڑھتے ہیں یا سراج الدولہ کا دربار دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے کے اندر پیدا ہونے والا ادب یا ادیب زمانے کا رخ متعین کر رہے ہوتے ہیں۔ اطہر حسین "ایوانِ اردو دہلی" میں شامل اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

> ادب اور سماج کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ یہ ہمیشہ سے سماج کا ترجمان رہا ہے۔ ناقدینِ فن کا یہ بھی خیال ہے کہ شعوری اور غیر شعوری طور پر ادب زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان ہوتا ہے کیونکہ ادیب و تخلیق کار معاشرے ہی کا ایک حصہ ہیں۔ وہ معاشرے میں پلتا بڑھتا ہے اور یہاں ہونے والے واقعات و حادثات سے متاثر ہوتا ہے اور پھر اسی کو تخلیق کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے"[۲۳]

گویا ادب کی تخلیق میں بنیادی اور اہم کردار سماج کا ہے جس میں ادیب رہتا ہے۔ اس کو تخلیق کی تحریک اور مواد دونوں ہی سماج سے ملتے ہیں۔ وہ سماجی واقعات کے پیشِ نظر سماج کی وہ شعوری اور فکری تصویر پیش کرتا ہے جو عام آدمی سے اوجھل ہوتی ہے۔ لہذا ادب ہو یا سماج دونوں کو سمجھنے کے لئے دونوں کا مطالعہ اور مشاہدہ از بس ضروری ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید

> "ادب ایک ایسا سماجی عمل ہے جو زبان اور تخلیق کے حوالے سے بالواسطہ طور پر زندگی معاشرے اور عوام کو متاثر کرتا ہے"[۲۴]

گویا زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے عوامل میں ادب ایک اہم سماجی عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی عمل میں سماجی شعور بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور کوئی بھی تخلیق کار اپنے عہد سے لاتعلق رہ کر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "کوئی ادیب ان ساری ادبی روایات اور ان تمام افکار و خیالات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا جو اس کا طبقہ، اس کا شعور، اور اس کا علم سب مل کر اس کے لئے مہیا کرتے ہیں۔ اس نقطہء نظر سے ادب کی حیثیت سماجی اور طبقاتی ہو جاتی ہے"[۲۵]

ادب سماج اور ماحول کا عکاس ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مختلف زبانوں میں جو ادب پروان چڑھا ہے۔ اس میں معاشرے میں ہونے والے واقعات حالات وواقعات اور طرزِ فکر، رسم ورواج کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق کا خیال ہے:

"ادب زندگی کا جزو ہے ہماری تہذیب وتمدن کا آئینہ ہے جیسے ہماری زندگی کے حالات ہوں گے ویسا ہی ہمارا ادب ہوگا"[۲۶]

صحیح معنوں میں ادب وہ ہے جس سے زندگی کی پیچیدگیاں رقم ہوسکیں۔ ایک توانا اور صالح معاشرہ وجود آسکے۔ اگر ایسا نہ ہوسکے تو ادب کا مقصد ہی فوت ہوجائے۔

کسی سماج کے تناظر میں تخلیق کردہ ادب اس سماج کے جذبات واحساسات ہی نہیں بلکہ اس کی عملی زندگی کے ہر ہر گوشہ کو اپنے جلو میں سمیٹ لیتا ہے اور پھر وہ ادب اس کے تہذیب وتمدن، اس کے رسوم رواج، اس کے عقائد ونظریات اور اس کے جذبات کا امین بن جاتا ہے۔[۲۷]

حقیقت یہ ہے کہ ادب کو سماج سے کسی بھی طرح الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی فن پارے میں عصری رجحانات اور وقتی مسائل کا عکس نہیں ہوگا تو وہ ادب دیرپا نہ ہوگا۔ کوئی بھی فن پارہ جب سماج کی تنقید کرتا ہے تو گویا وہ معاشرے کی تعمیر کررہا ہوتا ہے۔ اس تعمیر میں وہ سماج کے لئے اس کے تشکیلی عناصر کے پیش نظر ایک معیار مقرر کرتا ہے۔ یہ معیار ان اقدار کی صورت میں ہوتا ہے جو ادیب معاشرے میں رائج دیکھنا چاہتا ہے۔ ایسی تمام اقدار جو معاشرے میں توازن اور اس کی بقا کا سبب ہوں اعلی سماجی اقدار کہلاتی ہیں۔ کسی بھی ادب پارے کو اس سماجی تناظر میں پرکھنے سے پہلے سماج کے مختلف شعبوں کے حوالے سے اعلی سماجی اقدار کا تعین ضروری ہے۔ یہ مقالہ محمد الیاس کے ناولوں سے متعلق ہے جن کا خمیر پاکستانی معاشرہ ہے، لہذا اس پر تنقید وتحقیق سے پہلے ضروری ہے کہ پاکستانی سماج کے اہم تشکیلی عناصر کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف عناصر کے اعتبار سے اعلی سماجی اقدار کا تعین کیا جائے۔

۴۔ اعلیٰ سماجی اقدار

قدر ایک عمومی تصور ہے جو افرادِ معاشرہ میں اچھائی اور برائی کے مشترکہ معیار کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو پسند اور ناپسند کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتا ہے۔ معیار کے اسی عمومی تصور کی

وجہ سے کوئی صورت حال اعلیٰ وارفع قرار دی جاتی ہے جبکہ کوئی پستی کی حامل نظر آتی ہے۔ اسی حوالے سے رابن ایم ولیمز اپنے مضمون "Individual and Group values" میں لکھتے ہیں:

> "We have defined values as that conception of desirable states of affairs that are utilized in elective conduct as criteria for reference or choice or as justification for proposed or actual behavior" [۲۸]

رابن کے نزدیک سماجی اقدار وہ معیار ہیں جن پر فرد کے کسی رویے کو پسندیدہ یا ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے، یا دوسری صورت میں اعمال کا وہ معیار جو ایک خاص معاشرہ متفقہ طور پر اپنے تمام افراد میں دیکھنا چاہتا ہے وہ سماجی اعلیٰ اقدار میں شامل ہیں۔ رابن طے شدہ معیار کو وہ حوالہ قرار دیتا ہے کہ جس کی بنیاد پر معاشرے میں ہونے والی ہر تبدیلی اور انجام دیئے گئے کسی بھی عمل کو پرکھا جاتا ہے۔ اسی تعریف کو "Individual in society" کے مصنفین کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

> "Beliefs about what is a desirable or a "good" (e.g. free speech) and what in an undesirable or a "bad" (e.g. dishonesty" [۲۹]

اس تعریف کو دیکھا جائے تو سماج میں اچھائی اور برائی کا عقیدہ جن بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے وہ ہی سماجی اقدار ہیں۔ اعلیٰ اقدار کی نفی برائی تصور کی جائے گی۔ گویا اچھائی اور برائی کا تعین ہر معاشرے میں اپنے بنائے ہوئے اقداری نظام پر منحصر ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ افرادِ معاشرہ ان پسندیدہ و ناپسندیدہ اقدار کو اپناتے ہوں۔ وہ بعض اقدار کو پسندیدہ و مثبت سمجھتے تو ہیں مگر ان پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ مثال کے طور پر ایمانداری اور مساوات جیسی مثبت اقدار پر یقین رکھنے کے باوجود ان اقدار کو اپنی زندگیوں میں اپنا نہیں سکتے۔ اقدار تغیر پذیر ہوتی ہیں۔ یہ مثبت اور منفی دونوں طرح کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح سماجی اقدار کے حوالے سے سبطِ حسن لکھتے ہیں:

"کسی معاشرے میں روابط و سلوک، اخلاق و عادات، طرزِ بود و باش، رسم و رواج، حسن و جمال اور فن و اظہار کے جو معیار رائج ہوتے ہیں وہ ہی اس معاشرے کے سماجی اقدار کہلاتے ہیں"۔[۳۰]

سماجی اقدار معاشرتی استحکام اور کردار سازی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ معاشرے اور ان اقدار کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ اعلیٰ سماجی اقدار زندہ معاشروں میں جنم لیتی ہیں۔ اعلیٰ سماجی اقدار دراصل کسی معاشرے کی زندگی یا موت کا پیرامیٹر بھی ہوتی ہیں کیونکہ اگر معاشرے میں ان اقدار کا انحطاط شروع ہو گیا ہے یا ان کی عدم موجودگی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ شکست و ریخت کا شکار ہے اور اگر صورتحال اس کے برعکس ہے تو معاشرہ بلاشبہ ارتقاء پذیر ہے۔ گویا سماجی اقدار کی تخلیق اور ان کے ارتقاء سے اس صورت سے معاشروں کے بارے میں معلومات میسر آسکتی ہیں۔ سماجی اقدار دراصل کسی بھی سماج کی اخلاقیات ہیں اور اخلاقیات کا پاکیزہ ہونا تو ہر سماج میں بے حد ضروری ہے۔ اسی کو اعلیٰ سماجی اقدار کہا جاسکتا ہے۔

سماجی اعلیٰ اقدار سماج کے توازن کا نام ہیں۔ سماجی قدروں کے پیچھے تاریخی روایات ہوتی ہیں معاشرتی تجربے اور مشاہدے ہوتے ہیں نیز ان کا جمالیاتی ذوق ہوتا ہے ان سب کے ملاپ سے سماجی قدریں تشکیل پاتی ہیں۔ معاشرہ ان سماجی قدروں کی پاسداری کرتا ہے کیوں کہ سماج کی بقا کا دارومدار بہت حد تک انہی قدروں کے تحفظ پر ہوتا ہے۔ اگر ان سماجی قدروں کی پاسبانی نہ کی جائے اور ان کی طرف سے غفلت برتی جائے تو معاشرے کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے اور اس کی انفرادیت بھی باقی نہ رہے کیوں کہ معاشرہ ان سماجی قدروں کو اپنی ضرورت کے پیش نظر وضع کرتا ہے۔ ان قدروں میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں یہ جامد نہیں ہوتیں۔ یہ تبدیلیاں معاشرتی ماحول اور سماجی حالات میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ ان سماجی قدروں میں مذہبی، اخلاقی، ثقافتی اور سیاسی قدریں وغیرہ شامل ہیں۔

مذہبی اقدار

ہر مذہب میں مذہبی اقدار انسانی کردار سازی، رجحانات اور رویوں کو سمت دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ اقدار انسانی طرزِ فکر اور طرزِ عمل پر گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔ دنیا کا ہر مذہب مشترکہ اخلاقی قدروں کے ساتھ ساتھ مخصوص مذہبی اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مذہب اسلام میں والدین کی خدمت، ایفائے عہد، شرم و حیا اور پردہ وغیرہ کی اقدار پر زور دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر مذہب مخصوص اخلاقی اقدار

رکھتاہے۔ ان اقدار کا گہرا تعلق مذہب سے ہے۔ ہر مذہب انسانی طرزِ عمل اور رویوں کے لیے ضابطے مقرر کرتاہے۔ یہ حدودو قیوداس کے پیروکاروں کے لیے اخلاقی پیمانے کادرجہ رکھتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ایک مذہب کے ماننے والوں کی اخلاقیات کسی دوسرے مذہب کے پیراکاروں سے متصادم اور متضاد ہوں۔ مثلاً اسلام میں شراب کو حرام قرار دیا گیاہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرابی کو بدکردار اور قابل تعزیر سمجھا جاتاہے۔ اس کے برعکس کئی دوسرے مذاہب میں شراب کی اخلاقی لحاظ سے کوئی اُونچ نیچ نہیں ۔ ایک سماج میں مختلف مذاہب یکجا ہوسکتے ہیں۔ مخصوص مذہبی اقدار جو کسی مذہب کے عقائد سے تعلق رکھتی ہیں ان کے علاوہ جو عمومی اقدار ہیں اورانہیں ہر مذہب قبول کرتاہے اخلاقی اقدار کہلاتی ہیں۔

اخلاقی اقدار

اخلاقی اقدار شخصیت و کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں اخلاقی اقدار کی پختگی عظمت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اخلاقی اقدار ایک فرد کے ضمیر کا حصہ بن کر اچھائی اور برائی میں تمیز کا پیمانہ بن جاتی ہیں۔ بعد ازاں یہی اقدار ساری زندگی اس کے عمل، رویوں اور رجحانات کو متعین کرتی ہیں۔ اخلاقی اقدار ہی سماجی کے چناؤ میں پس پردہ اپنا کردار ادا کر رہی ہوتی ہیں۔

ہر سماج میں دوسروں کے ساتھ صحیح روابط قائم کرنے کے لیے کچھ قواعد وضوابط اور اُصولوں کی رعایت ضروری ہے۔ تاکہ اول یہ کہ ہم خود کو اپنے معاشرے میں ایک اچھی اور مثالی شخصیت کے طور پر پیش کر سکیں چنانچہ اگر ہم کامیاب ہوگئے تو ہمارے اخلاق کو دیکھ کر ہم سے رابطہ رکھنے کے خواہش مند ہوں گے نیز اس سے ہماری اقدار بھی بلند ہو گی۔ دوسرا یہ کہ اس کے ذریعے دوسروں کے حقوق پہچان کر انھیں ادا کرنے کی کوشش کی جائے گی اورانھیں پامال کرنے سے بچاجاسکے گا۔ یہ اصول وضوابط دو قسم کے ہیں۔ کچھ ایسی صفات اور خصوصیات ہیں جن پر دوسروں سے رابطہ رکھتے ہوئے عمل کرناچاہے اور کچھ ایسی برائیاں ہیں جن سے پرہیز کرنا چاہیے۔ جب تک ان اصولوں پر عمل نہیں کیاجائے گا اس وقت تک سماجی زندگی بہتر نہیں ہوسکتی۔

ہر معاشرے میں انسانی کردار کی عظمت کو اخلاقی بنیادوں پر پرکھا جاتاہے۔ جس کے لیے کچھ اخلاقی ضابطے اور معیار مقرر کیے جاتے ہیں۔ جو معاشرے کے استحکام اور توازن کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی مانند اہم

ہوتے ہیں۔ یہ انسانیت کا طُرہ امتیاز ہیں اورانسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر دلالت کرتے ہیں ۔ انہی اخلاقی ضابطوں کا تصور اخلاقی اقدار کہلاتا ہے۔ معاشرہ اگر ان اقدار پر عمل پیرا ہو تو تمام اخلاقی برائیاں خود بخود ختم ہو جائیں اور معاشرہ امن، اخوت اور بھائی چارے کا گہوارہ بن جائے بصورتِ دیگر زوال قوموں اور معاشرے کا مقدر بن جاتا ہے۔ اخلاقی اقدار آفاقی، مطلق اور گروہی ہو سکتی ہیں۔ کسی بھی سماج کے افراد اپنی زندگی میں بہت سے افعال سر انجام دیتے ہیں جو ان کے حقِ حیات کے علاوہ ان کی نظریاتی وابستگیوں کے بھی مظہر ہوتے ہیں۔ یہ مجموعی اقدار ثقافتی اقدار کہلاتی ہیں۔

ثقافتی اقدار

ثقافتی اقدار کا تعلق ماضی کی روایات سے ہے۔ یہ اقدار قدیم روایات کی صورت میں آباؤاجداد سے منتقل ہوتی ہیں۔ یہ اقدار معاشرتی دباؤ میں سخت ہوتی ہیں اوران کا ارتقاء قدیم رسم ورواج کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ ان سے انحراف کرنا گویا معاشرتی موت ہوتی ہے۔ ان اقدار میں وہ تمام رسم ورواج اور عقائد شامل ہیں جو آج بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ اقدار زیادہ تر خاندان، مذہب اور تعلیم سے تعلق رکھتی ہیں۔

سیاسی اقدار

نظامِ سیاست و معاشرہ کو درست رکھنے کے لیے سیاسی اقدار کی حیثیت مسلمہ ہے۔ جب معاشرے میں مختلف سیاسی وحدتیں باہم دست و گریباں ہو جائیں اور ایک وحدت ہوس گیری کے چکر میں پھنس کر دوسری وحدت پر حملہ کر دے، تب ان اقدار کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی فتنہ پرور اور شر انگیز عناصر کے خلاف کردار ادا کریں۔

سیاسی قدریں اس وقت اخلاقی انحطاط کا شکار ہوتی ہیں جب سیاست میں مشاورت پر عمل نہ کیا جائے۔ خود نمائی اور اپنے آپ کو کسی کے سامنے جوابدہ نہ سمجھنا، خود کو انسانوں کا رب سمجھنا شروع ہو جانا معاشرتی بگاڑ اور زوال کا سبب بنتا ہے۔ گویا اقدار انسان کے نصب العین، اس کے بلند مقاصد اور ترجیحات میں جہاں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ وہاں ان مقاصد کے حصول میں یہ اقدار فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی زندگی میں کسی معاشرے کے افراد کا مثبت قدروں پر یقین اور عملی زندگی میں ان پر عمل پیرا ہونا اس معاشرے کو مثالی بنا دیتا ہے۔ جس سے صبر و شکر، قناعت و توکل، رواداری، تحمل و برداشت جیسے رویے جنم

لیتے ہیں جبکہ منفی قدریں مادہ پرستی، لالچ، حسد، بغض جیسی برائیوں کو جنم دیتی ہیں۔ جس سے معاشرے میں بے سکونی بڑھتی جاتی ہے اور معاشرہ عدم برداشت کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ جو معاشرے کی شکست وریخت کا سبب بنتا ہے۔ ایسی صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بدلتے ہوئے معاشرتی حالات سے فکری ہم آہنگی نہ ہو۔ یہ رویہ معاشرتی اقدار کی شکست وریخت کا سبب بنتا ہے۔ ان سماجی اقدار کا تعین ہر معاشرے میں چونکہ الگ ہے اور عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں سے بھی اثر قبول کرتا ہے۔ انہی اقدار کے تعین میں اور ان کے بگاڑ کو سمجھنے میں کسی بھی ادیب کا سماجی شعور کام آتا ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی ادب پارے میں ادیب معاشرے کے لیے مختلف جہات میں جو اعلیٰ اقدار متعین کرتا ہے اور معاشرے کے جن جن اعمال کو معاشرے کی تخریب کا سبب جانتے ہوئے انہیں سماجی برائیاں قرار دیتا ہے۔ وہ اس کے لیے سماجی شعور کا اظہار ہے۔ اردو ادب میں اس خطے میں ہونے والی سماجی تبدیلیوں کے پیشِ نظر عہد بہ عہد مکمل سماجی شعور کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ جن کے نتیجے میں ادیبوں نے اپنے سماجی شعور کو ان فکری اور فنی جہتوں سے ادب کا حصہ بنایا۔ اس کی تفہیم کے لیے ہم اردو ناول میں سماجی شعور کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔

۵۔ اُردو ناول میں سماجی شعور کا پسِ منظری مطالعہ

ادب زندگی سے فیض حاصل کرتا ہے۔ ادب کی بنیاد زندگی اور اس کے مسائل سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کے اردو ادب میں اس دھرتی کا رنگ وروپ سمایا ہوا ہے۔ نثر ہو یا شاعری دونوں میں ہندوستانی رنگ اور اس کے سماج کے رنگوں کا عکس بھرپُور انداز میں نظر آتا ہے۔ اردو ادب میں نثری ادب میں ناول ایک مقبول صنف ہے۔ جس نے اپنے ابتدائی ایام سے آج تک ہندوستانی ماحول اور سماج کی برابر عکاسی کی ہے۔ ان ادوار میں جو ناول لکھے گئے ان ناولوں کا موضوع زیادہ تر سماجی مسئلے ہوتے اور ان کا مقصد بھی اصلاح ہوتا۔

عہد بہ عہد ہونے والی انسانی ترقی میں تہذیبی وتمدنی قدروں کی تبدیلی سے رجحانات اور تصورات بھی بدلتے رہے۔ نئے تصورات اور رجحانات سامنے آتے رہے تھے۔ ان بدلتے ہوئے تصورات اور رجحانات کی بدولت کچھ قدریں ٹوٹتی ہیں اور کچھ روایتی قدریں نئے سانچوں میں ڈھلتی رہتی ہیں۔ ایسے میں ناول نگاروں کا نصب العین حقیقت کے بدلتے ہوئے تصورات اور رجحانات کی ضرورت واہمیت کو محسوس کرنا ہوتا ہے نیز ان کا مقصد سماج کی عملی قوتوں کو ابھار کر انسانی ترقی کی راہ میں حائل قوتوں کے خلاف جدوجہد کرنا اور ملک کی

سیاسی اقتصادی اور سماجی حالتوں کو بدل کر زندگی کو آگے بڑھنے میں مدد دینا ہے۔ کیوں کہ ادیب معاشرے کا نمائندہ تصور کیا جاتا ہے یوں وہ اپنے عہد کے حالات سے باخبر ہوتا ہے۔ حسن عسکری تحریر کرتے ہیں:

> "جب زندگی اور موت کا سوال درپیش ہو تو ادیب کا ردعمل وہی ہوتا ہے جو ایک تانگے والے کا۔ اس وقت قوم دونوں سے خدمت لے سکتی ہے اور دونوں میں سے کسی کو عذر نہیں ہونا چاہیے"۔[۳۱]

اردو ناول کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی جب انیسویں صدی میں برطانوی حکومت کے استحکام کا دور شروع ہوا۔ اردو میں ابتدا ہی سے ناول کا رشتہ سماج سے قائم ہو گیا تھا اور یہ رشتہ بڑی حد تک سماج کی عکاسی کرنے لگا۔ جس سے ہمیں اس دور کے لکھے گئے ناولوں میں سماجی شعور کی تاریخی بصیرت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کا زمانہ مذہبی، سیاسی اور سماجی اعتبار سے سماجی شعور کی بیداری کا زمانہ تھا۔ اس دور کے ناول نگاروں کی تخلیقات میں سماجی حقائق و مسائل کو پر خلوص انداز میں پیش کیا گیا۔ جس سے نئے نئے سماجی رشتے وجود میں آئے اور زندگی نئے سانچے میں ڈھلنے لگی۔ ان ناول نگاروں میں اولین نام ڈپٹی نذیر احمد کا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے تقریباً سبھی ناولوں میں گھریلو معاشرت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان ناولوں میں انہوں نے سماجی حقائق بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں سماجی اقدار پر زور دیا اور گھریلو معاشرت کو نئے سماجی حقائق کی روشنی میں مرتب کرنے کی کوشش کی۔ جس کی واضح مثال "مراۃ العروس" "توبتہ النصوح" اور "بنات النعش" ناول ہیں۔ جن میں انہوں نے عام انسانی زندگی کی ٹھوس کی حقیقتوں کو نمایاں کیا ہے ڈاکٹر سید عبداللہ قمطراز ہیں:

> "نذیر احمد کے ناولوں کی اس اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت کے ایک اہم دور کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان ناولوں میں اس عہد کی ذہنیت، سماجی تصورات اور معاشرتی نظریات کے بہترین مرقعے دستیاب ہوتے ہیں۔"[۳۲]

اردو کا پہلا ناول مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ نذیر احمد نے اس ناول کے ذریعے زوال پذیر معاشرے میں رہنے والے مسلمانوں کی گھریلو زندگی کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ارادہ کیا کہ ایک ایسی کتاب تحریر کی جائے جو اخلاق و نصیحت کا درس دے سکے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل میں خواتین کے لیے مددگار ثابت ہو۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

"تمدنی حالات کا جائزہ لینے کے بعد ڈپٹی نذیر احمد نے درمیانے خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد کی گھریلو اور سماجی زندگی کو موضوع بنایا اور زندگی کے اتار چڑھاؤ کو واضح انداز میں تحریر کیا۔"[۳۳]

"ایامی" ناول نذیر احمد کے سیاسی اور سماجی شعور کا آئینہ دار ہے۔ اس ناول کے ذریعے ایک بڑی معاشرتی برائی کو بیان کیا گیا ہے جیسا کہ ہندوؤں کے ہاں بیوہ کی دوبارہ شادی نہیں ہو سکتی۔ نذیر احمد نے اس مذہبی طبقہ کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں مذہب سے وابستگی کے باوجود طرزِ معاشرت میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں وہ نذیر احمد کی گرفت سے نہیں بچ سکیں۔ اس حوالے سے آل احمد سرور بیان کرتے ہیں:

"اسلامی سوسائٹی اور خاص کر اسلامی خاندانوں کی اندرونی معاشرت کی جو تصویریں نذیر احمد نے کھینچی ہیں۔ وہ ایسی بے لاگ ہیں کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ پھر جاتا ہے اور ان کے قلم میں بلا کا زور اور جوش ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی کہانیاں ان بھی مقبول ہیں اور بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ یہی ان کی ابدی زندگی کی ضمانت ہے۔"[۳۴]

نذیر احمد کے بعد دوسرے ناول نگار سرشار ہیں۔ ان کا دور اصلاحی تحریکات کا عہد ہے۔ انہوں نے اپنے ناول فسانہ آزاد میں اپنے عہد کے سماج کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ "فسانہ آزاد" کے ذریعے انہوں نے لکھنؤ کی زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں پیش کی ہیں۔ "فسانہ آزاد" کے حوالے سے یوسف حسین سرمست لکھتے ہیں:

"انھوں نے لکھنؤ کے معاشرے اور زندگی کو پیش کیا ہے۔ لیکن اس معاشرے کی یہ ایسی مکمل جامع تصویر ہے کہ اس میں محلوں سے لے کر بازار تک، زاہدانِ خشک سے رنگین مزاجوں تک، بیگمات سے لے کر پریوں تک، حرم سراؤں سے لے کر کوٹھوں تک، معشوقان عشق پیشہ کی عیاریوں سے لے کر حسین پردہ نشینوں کی سادہ پرکاریوں تک ہر مقام اور ہر شخص کا حال سچا بھی ہے اور دل آویز بھی"۔[۳۵]

ان کا آخری اور اہم ناول "کامنی" ہے۔ جس میں سرشار نے ایک راجپوت گھرانے کی زندگی اس کے ماحول اور رسم ورواج کی تصویر کشی کی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار کامنی ایک وفا شعار بیوی ہے۔ سرشار نے "فسانہ آزاد کے ان ذریعے ان رسم ورواج کی نفی کی ہے۔ جو انسانیت کی روح کے منافی ہیں۔ یہ مذہب کے نام پر ذات

پات کی تفریق کو نہیں مانتے۔ وہ چاہتے تھے کہ نئے علوم اوراصلاحی تحریکوں کی بدولت برابری کی سطح کاایک نیا معاشرہ پیداہو۔ان کے دیگر ناولوں میں "سیر کہسار"، "جامِ سرشار"، وغیرہ شامل ہیں۔ "جامِ سرشار" فسانہ آزاد جدید کے عنوان سے " اودھ اخبار" میں شائع ہوا تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے بعد ناول نگاری کے میدان میں عبدالحلیم شرر کانام لیاجاتاہے۔

"فردوس بریں" عبدالحلیم شرر کی وجہ شہرت ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے عبدالحلیم شرر کے آٹھ ناول سماجی ناول ہیں۔ جن کے نام "دلچسپ" "دل کش" "بدرانساء کی مصیبت" "آغاصادق کی شادی" "خوفناک محبت" "غیب داں دلہن" "حسن" وغیرہ ہیں۔ شرر نے اپنے ناولوں کے ذریعے مسلمانوں کے متوسط طبقے کی معاشرتی، اخلاقی، معاشی اور مذہبی اصلاح کی کوشش کی ہے احسن فاروقی لکھتے ہیں:

> "وہ ایک طرح ناول نگاری کے موجد ضرور ہیں ناول نگاری کے اصولوں اور ظاہری لوازمات کو جیسا انہوں نے برتا کسی نے نہیں برتا"۔[۳۶]

اردوناول نگاری کاایک اہم نام علامہ راشدالخیری ہیں۔ انھوں نے مسلمان معاشرت پر قلم اٹھایا۔ راشدالخیری نے تمام عمر حقوق نسواں کی حمایت اور بہتری میں صرف کی۔ انھوں نے معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ معاشرتی حیثیت کوبلند کرنے کی کوشش کی ۔ ان کے تمام ناولوں میں گھریلوزندگی محوراور مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ راشدالخیری کے ناولوں میں "صبح زندگی" "شام زندگی" "بیوہ" اور "جلوہ ایثار" وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعدناول نگار محمد سعید کانام آتاہے ان کاناول "خواب ہستی" ان کی وجہ شہرت بنا۔ اس ناول کے ذریعے انہوں نے معاشرے میں رونماہونے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں فرد پر ہونے والے اثرات کوبیان کیاہے۔ "خواب ہستی" کااہم کردار عثمان ہے۔ جو معاشرتی تبدیلیوں اورانتشاروافتراق کی بدولت درست راہ متعین نہیں کرسکتا۔ جس میں افراد معاشرہ اپناذہنی توازن برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اس کے بعد آنے والے ناول نگاروں میں منشی سجاد حسین اور محمد علی طبیب کے نام قابل ذکرہیں۔ منشی سجاد حسین نے لکھنو کی معاشرت کوفنی خوبیوں کے ساتھ پیش کیاہے۔ "اودھ پنچ" کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے اپنے زمانے کی آگاہی کو پیش کرنے والے ناول نگاروں میں اہم سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے ناول "کایاپلٹ" میں سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ اس دور کے معاشی اور سیاسی مسائل کو بھی بیان کیاگیاہے۔ ان کے دیگر ناولوں میں "حاجی بغلول" "میٹھی چھری" "احمق الزین" "حیات شیخ چلی" اور "پیاری دنیا" شامل ہیں۔

مندرجہ بالا جن ناولوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں اپنے زمانے کی سماجی حقیقتوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ ناول سماجی برائیوں کو سامنے لاتے ہیں۔ اردو ناول نگاری کے ضمن میں ایک اہم نام مرزا ہادی رسوا کا ہے۔ ان کے ناولوں میں "ذات شریف" "شریف زادہ" اور "امراؤ جان ادا" شامل ہیں۔ ان کا شاہکار ناول "امراؤ جان ادا" ہے مرزا رسوا کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر رقم طراز ہیں "مرزا ہادی رسوا کے قلم کی بدولت اردو ناول پہلی مرتبہ حقیقت نگاری کے ذائقے سے آشنا ہوا"۔[۳۷]

مرزا ہادی رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا" میں طوائف کی معاشرے سے ہم آہنگی فرد اور سماج کے متعلق سماجی شعور کھل کر سامنے آتا ہے۔ ناول میں مرزا نے اپنے عہد کے سماج کی ہو بہو تصویر پیش ہی نہیں کی ہے بلکہ ناول میں انسانی معاشرے کی تصویر پیش کشی بھی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ناول میں لکھنوی معاشرت کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں خورشید السلام لکھتے ہیں:

> "امراؤ جان ادا کا موضوع زوال ہے یہ زوال ایک خاص معاشرت کا ہے جو اودھ کے چند شہروں میں محدود تھی"۔[۳۸]

ناول نگاری کے میدان کا ایک اہم نام پریم چند ہے۔ پریم چند ایک عہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستانی ادب پر پریم چند کے احسانات کا ایک طویل سلسلہ ہے کہ انہوں نے ادب کو صحیح معنوں میں انسانی زندگی کا ترجمان بنایا۔ معاشرتی مسائل کی عکاسی کی اور ناول کو فن کی نزاکتوں کے ساتھ برتا۔ ان کے ناولوں میں "بازارِ حسن" "گوشہ عافیت" "میدانِ عمل" "گئودان" "بیوہ" اور "نرملا" وغیرہ شامل ہیں سحر انصاری کے مطابق:

> "اردو ناول عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار اور مرزا ہادی رسوا کے بعد جب پریم چند تک پہنچا تو اس سے حقیقت نگاری کے عناصر کو ترقی ملی اس طرح اردو ناول کی جدید شکل اس صدی کے ساتھ ساتھ ظہور پذیر ہوئی"[۳۹]

پریم چند کے ناولوں کا سب سے اہم وصف حقیقت نگاری ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل کے مرقعے پیش کیے ہیں۔ پریم چند کے ناولوں میں "گئودان" کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ گئودان" میں سماجی شعور اور اصطلاحی رنگ نمایاں ہیں۔ ان کے ناولوں میں ایک طرف گھریلو معاشرت کی تصویریں نظر آتی ہیں اور دوسری طرف سماج کے مختلف طبقات کا عکس نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے

ناولوں میں تعصب، جاگیر دارانہ ماحول ،غربت، جہالت، رسم ورواج ،توہم پرستی، کسانوں مزدوروں کے استحصال کو بیان کیا ہے۔

پریم چندنے ناولوں میں سچائی مذہبی اور معاشرتی اصلاح کوزیر نظر رکھا۔اس حوالے سے رام بابو سکسینہ کا کہنا ہے:

"آپ کبھی مبالغے کو اپنی تصانیف میں پاس نہیں آنے دیتے اور نہ کبھی حق اور سچائی سے انحراف کرتے۔[۴۰]

پریم چند کی ناول نگاری کے حوالے سے آل احمد سرور لکھتے ہیں:

"پریم چند کا میدان اتنا ہی وسیع ہے۔ جتنی کائنات وہ ایک اچھے قصہ گو اور درجنوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق تھے۔ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران اور توران کے قصے نہیں لکھتے، وہ یہیں کے مال سے اپنی دوکان بساتے سجاتے ہیں۔ مقامی خصوصیات ان کے ہاں اول سے آخر تک جھلکتی ہیں"[۴۱]

اس جدید عہد کے ناول نگاروں کی تاریخی اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر طیبہ خاتون رقم طراز ہیں:

"۱۹۱۴کے بعد کے ناولوں میں فن کے ارتقاء کی صورتیں واضح طور پر سامنے آنے لگی ہیں جو اس سے پہلے کئی پردوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ اس لیے ابتدائی دور کے ناول فن کے نقطہ نظر سے دوسرے دور کے ناولوں سے کم تر ہیں۔ لیکن اردو ناول کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں"[۴۲]

اردو ناول نگاری کا دوسرا عہد ترقی پسندوں کا عہد ہے۔انہوں نے ناول کو نئے رجحانات سے روشناس کروایا۔اس حوالے سے ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

"انہوں نے فرد اور سماج کے بدلتے ہوئے رشتوں کو سمجھتے ہوئے سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ فرد کے کردار اور اس کے تجربات پر زور دیا"[۴۳]

ترقی پسندی کے ابتدائی دور کا ایک نام قاضی عبدالغفار ہے۔ان کے ناول اپنے دور کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔"لیلی کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" میں مذہب اخلاق اور سماج کے تراشے ہوئے بتوں کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ان کے ناولوں "لیلی کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" کے حوالے سے پروفیسر امجد علی شاکر لکھتے ہیں۔"قاضی صاحب کے ہاں رومان پسندی اور حقیقت پسندی گلے مل رہی ہیں۔"[۴۴] اس کے بعد آنے

والے ناول نگاروں میں عظیم بیگ چغتائی ایک اہم نام ہے۔ عظیم بیگ چغتائی نے سماجی اوراخلاقی بندشوں سے بیزاری کااعلان کیاہے۔ ان کااہم ناول "خانم" ہے۔ خواتین ناول نگاروں میں رضیہ بٹ نے سماج کے فرسودہ ماحول روایات اور سماج سے پیدا ہونے والی کشمکش کو بیان کیاہے۔ جس کی مثال ان کے ناول "زرتاج" میں ملتی ہے۔ "لندن کی ایک رات" سجاد ظہیر کاناول ہے۔ جس میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر مزدوروں اور کسانوں کے مسائل کو پیش کیاہے۔ یہ ناول ہندوستان کی سماجی حقیقتوں کا آئینہ دار ہے۔ اس مختصر ناولٹ کے بارے میں ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

> "اس ناولٹ نے لفظوں کو نئے سیاسی وسماجی شخصیات میں بدل کر اردو ناول کو نیا انداز دیا، جو آگے چل کر ترقی پسندوں کے ہاتھوں سماجی و تہذیبی مسائل کے اظہار کے وسیلے کے طور پر کام آیا۔[۴۵]

عزیز احمد ترقی پسند تحریک سے وابستہ ایک اہم ناول نگار ہیں۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی میں اپنا پہلا ناول "ہوس" لکھا۔ جو بلحاظِ موضوع حیدرآباد کے مسلم گھرانے پر مشتمل ہے۔ جو پردے کی سخت روایات کا پابند ہے۔ اس کے بعد "مرمر اور خون" "گریز" "آگ" "ایسی بلندی ایسی پستی" جیسے ناول لکھے۔ "ان کے ناولوں میں سب سے زیادہ مقبولیت "گریز" نے پائی۔"[۴۶] کرشن چندر نے اپنے ناول "شکست" میں جاگیر دارانہ سماج کی کشمکش کو موضوع بنایاہے۔ ان کے دیگر ناولوں میں "الٹا درخت"، "گدھے کی سرگزشت"، "غدار"، "برف کے پھول" اور "مٹی کے صنم" شامل ہیں۔ کرشن نے ناولوں میں ہندوستانی معاشرے کے تمام مسائل کو پیش کیاہے۔ انھوں نے فسادات، قحط بنگال، ذات پات، افلاس، بھوک، بیماری اور دوسرے عام سماجی مسائل پر ناول لکھے۔ ناول "شکست" کے ذریعے طبقاتی تقسیم فرسودہ رسم ورواج اور غریبوں کے استحصال جیسے مسائل کی طرف اشارہ کیاہے۔ اس دور کے دیگر ناول نگاروں میں "خواجہ احمد عباس" کانام قابل ذکر ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ناولوں میں "انقلاب"، "سیندی" اور "سیاہ سورج سفید سائے" شامل ہیں۔ انھوں نے "سیاہ سورج سفید سائے" میں اشتراکی جمہوریت پر چلنے والے نو آبادی ملکوں کے خلاف جاگیر دارانہ نظام کی جارحانہ ظلم وستم کا پردہ فاش کیاہے۔[۴۷]

تقسیم ہند نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کو متاثر کیاوہیں ادب پر بھی اپنا گہرا اثر چھوڑا اردو ناول نگاروں نے فرقہ وارانہ فسادات ماضی پرستی کو موضوع بنایا۔ ترقی پسند تحریک کے ذیل میں لکھنے والوں میں ایک نام عصمت چغتائی کا ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے عہد کے مکمل عکاس ناول لکھے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں

کے ذریعے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں اور سماج کے گھناؤنے پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔ انہوں نے عورتوں کی نفسیاتی وذہنی کشمکش اور گھٹن بھری زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ عصمت نے فسادات، طبقاتی کشمکش، عورتوں کے نفسیاتی اور جنسی مسائل مردانہ سماج کی بالادستی کو مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ عصمت چغتائی کے ناولوں میں "ٹیڑھی لکیر" "ضدی" "معصومہ" اور "سودائی" شامل ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے ایک ناولٹ "ایک چادر میلی سی" لکھا جس میں بیدی نے غربت، جہالت، توہم پرستی اور عورتوں کی نفسیات کو بیان کیا ہے۔ جو ان کے سماجی شعور کا پتہ دیتا ہے، ان کا یہ ناولٹ پسماندہ سماج کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس دور کے دیگر ناول نگاروں میں حیات اللہ انصاری، ایم اسلم، رامانند ساگر شامل ہیں۔ حیات اللہ انصاری نے " لہو کے پھول" کے عنوان سے ایک ناولٹ لکھا جو برصغیر کے سیاسی اور سماجی واقعات پر مشتمل ہے اس ناول میں سیاسی وسماجی حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ ملتا ہے اس کے علاوہ ان کے دو ناولٹ "گھروندہ" اور "مدار" قابل ذکر ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی ادیبوں نے جو ناول لکھے اس میں انہوں نے عام انسانوں کی سماجی زندگی میں آئے دن جو سیاسی معاشی اور اقتصادی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے تھے ان کو بیان کیا ہے۔ اس عہد میں لکھے جانے والے تمام ناولوں میں برصغیر کے حالات وواقعات، سیاسی، سماجی اور معاشی زبُوں حالی نیز ہجرت کے حوالے سے ایک درد موجود ہے۔ فضلی کے ناول "خون جگر ہونے تک" میں پاکستان بننے تک کی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے۔ اس صورتحال کو بیان کرنے والے ادیبوں میں ایک نام خدیجہ مستور کا ہے۔ ان کے ناولوں میں "آنگن" اور "زمین" شامل ہیں۔ "آنگن" کا شمار اردو کے اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔ "آنگن" کا موضوع معاشرتی ٹوٹ پھوٹ ہے۔ یہ ناول مسلمانوں کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کو بیان کرتا ہے۔ ناول سیاسی پارٹی، ہندوستانی رسم ورواج، انگریزی تعلیم، جاگیرداروں کی عیاشیاں، ہندو مسلم اتحاد، فرقہ ورانہ فسادات، انگریزوں کی سازشوں، گمراہ اور نوجوان نسل کی عکاسی کرتا ہے۔ "آنگن" رویوں کا انعام نہیں بلکہ دلوں کا انعام حاصل کرنے کے قابل ہے۔[۴۸]

اردو ناول نگاری کا ایک معتبر نام قرۃ العین حیدر ہے۔ قرۃ العین حیدر نے "آگ کا دریا" میں گوتم اور ابوالمنصور اپنے فرقوں کی سماجی معاشی اور طبقاتی حیثیتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ "آگ کا دریا" کے پہلے دور میں ذات پات اور چھوت چھات اور کئی معاشرتی برائیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول "میرے بھی صنم خانے" عورت کے سیاسی سماجی معاشی تہذیبی اور مذہبی پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ اس دور میں لکھے گئے دیگر

ناولوں میں "خوشیوں کا باغ از انور سجاد اور "دارالشکوہ"، "شب گذیدہ"، "حضرت جان" از قاضی عبدالستار شامل ہیں۔ جمیلہ ہاشمی مایہ ناز فکشن نگار ہیں۔ ان کے تحریر کردہ ناولوں میں "تلاشِ بہاراں"، "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو"، "جوگ کی رات"، "آتشِ رفتہ" اور "روہی" شامل ہیں۔ ناول نگاری میں انھوں نے انفرادیت کے وہ نقوش چھوڑے ہیں کہ جنھیں اردو کے ادبی حلقے کبھی فراموش نہیں کر سکتے[۴۹]۔ شوکت صدیقی کے لکھے ہوئے ناول "خدا کی بستی" اور "جانگلوس" اردو ناول نگاری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ خدا کی بستی کراچی کے ماحول پر لکھا گیا ناول ہے۔ جس میں شوکت صدیقی نے اخلاقی گمراہی و سماجی مسائل اور سیاسی و سماجی کشمکش کو بیان کیا ہے۔ یہ ناول بے روزگاری سماجی ناانصافی اور عدم مساوات کا بھرپور عکاس ہے۔ ناول نگار نے زندگی کے پیچیدہ حقائق کا حال ناول میں بیان کیا ہے۔ "خدا کی بستی" کے حوالے سے پروفیسر امجد علی شاکر لکھتے ہیں:

> "اس ناول کو ایک ترقی پسند ناول کہا جا سکتا ہے کیونکہ شوکت صدیقی نے اس ناول میں مقتدر طبقات اور مراعات یافتہ طبقہ کے طریقہ ہائے واردات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔"[۵۰]

احسن فاروقی بطور ناول نگار اور نقاد کے اپنی شہرت رکھتے ہیں ان کے اہم ناول" شامِ اودھ"، "رہ ورسم"، "آشنائی"، "آبلہ دل کا" اور "سنگم" اہم ناول ہیں۔ عبداللہ حسین اردو افسانوی دنیا میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات آپسی رشتوں زندگی کی الجھنوں اور مسائل کا ترجمان ہے ہے ناول میں جاگیر دارانہ مظالم جنگ کی خونریزی جلیاں والا باغ کا واقعہ کارخانے میں مزدوروں کی زندگی اور ہجرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بقول روبینہ الماس:

> "عبداللہ حسین نے اپنے ناولوں میں طبقات کی ہر سطح پر تفریق اور اس کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیہات میں طبقات کی ہر نوع جاگیر دار، عام زمیندار، سرمایہ دار، بڑے کاروبار والا، چھوٹے آڑھت والے، مزدور اور مزارعے اور سب سے بڑھ کر برادری نظام کی تخصیص کو پیش کیا ہے۔ مجموعی طور پر عبداللہ حسین نے اپنے ناولوں میں اپنے گہرے طبقاتی شعور کا اظہار کیا ہے۔"[۵۱]

فاضل ناول نگار کے دیگر ناولوں میں "باگھ" "قید" اور "نادار لوگ" شامل ہیں۔ محمد خالد اختر "چاکیواڑہ میں وصال" اور رشیدہ رضویہ کا "اسی شمع کے آخری پروانے" یہ تمام ناول ۱۹۷۰ تک ناول نگاری کے سفر کا اختتام

کرتے ہیں۔ اس کے بعد پاکستان میں اردو ناول کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، بلاشبہ نیا دور ناول کے عروج کا دور ہے۔

۱۹۷۱ء کے سانحہ پر بہت سے ادیبوں نے ناولوں کی بنیاد رکھی۔ جن میں الطاف فاطمہ کا "چلتا مسافر" مستنصر حسین تارڑ کا "راکھ"، طارق محمود کا "اللہ میگھ دے"، سلمی اعوان کا "تنہا"، رضیہ فصیح احمد کا "صدیوں کی زنجیر"، طارق اسماعیل ساگر کا "لہو کا سفر" شامل ہیں۔ صدیق سالک نے "ایمرجنسی" میں اور انیس ناگی نے "دیوار کے پیچھے" "محاصرہ" اور "کیمپ" میں سیاسی و سماجی جبر کی داستانیں سنائی ہیں ۔ مارشل لاء کے دور کو ثریا شہاب نے "سفر جاری ہے" میں پیش کیا۔ انتظار حسین نے "آگے سمندر ہے"، "بستی"، "چاند گہن" جیسے تخلیق کیے۔ انتظار حسین نے "چاند گہن" میں چاند کو ہندوستان کے ایک سیاسی واقعہ "غدر" کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ناول میں ۱۸۵۷ء کے زیرِ اثر ہندوستان کی سیاسی زندگی بالخصوص اُجڑتی ہوئی دلی کی سماجی زندگی اور ایک نئے سیاسی نظام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "بستی" میں تقسیمِ ہند اور سقوطِ پاکستان کا احاطہ کیا گیا ہے۔ نیز پاکستان کے سیاسی اور سماجی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ "ایوان غزل" از جیلانی بانو صالحہ عابد حسین "اپنی اپنی صلیب" "گوری سوئے سیج پر" نثار عزیز بٹ "نگری نگری پھرا مسافر" رحیم گُل کا "ضبط کی دیوار" آغا سہیل "غبار کوچہ جاناں" شمس الرحمان فاروقی "کئی چاند تھے سر آسماں" اردو ناول کی روایت میں بڑا اضافہ ہیں۔

اکیسویں صدی میں جس تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں ، حکومتِ وقت اور سیاست نے جو پلٹے کھائے، عالمی منظر نامے میں وطنِ عزیز کی خراب ہوتی ساکھ کو ناول نگاروں نے پیش کیا۔ اکیسویں صدی میں علی امام نقوی کا "بساط" بانو قدسیہ کا "حاصل گھاٹ" اور خالدہ حسین کا "کاغذی گھاٹ" جیسے اہم ناول لکھے گئے ہیں۔ موجودہ دور میں لکھے جانے والے ناولوں میں مشرف عالم ذوقی کا "لے سانس بھی آہستہ"، "محمد حمید شاہد کا "مٹی آدم کھاتی ہے"، "آمنہ مفتی کا "پانی مر رہا ہے"، "اختر رضا سلیمی کا "جندر" "محمد حفیظ خان کا "انواسی" "عاطف علیم "مُشک پوری کی ملکہ" "فتح محمد ملک کا "کوہِ گراں"، محمد الیاس کا "کُہر" "محمد عاصم بٹ کا "دائرہ" "مصطفی کریم کا "راستہ بند ہے"، "فہمیدہ ریاض کا "قلعہ فراموشی"، کاشف رضا سلیمی کا "چار درویش اور ایک کچھوا" اور علی اکبر ناطق کا "نو لکھی کوٹھی" شامل ہیں۔ ان ہم عصر ناول نگاروں میں سماجی شعور کے اعتبار سے محمد الیاس کے ناول اس تحقیقی مقالے کا موضوع ہیں۔ ناولوں کی تنقید سے پہلے محمد الیاس کی حیات و خدمات کا اجمالی جائزہ لیتے ہیں، تاکہ ان کے عہد اور سماج کے متعلق بنیادی آگاہی حاصل ہو جائے۔

ج۔ محمد الیاس کا تعارف

محمد الیاس کا شمار کا موجودہ دور کے بلند پایہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ اکیسویں صدی کے مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے متعدد ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ا۔ پیدائش اور خاندانی پس منظر

محمد الیاس نے ۲۲ دسمبر ۱۹۴۶ء کو ضلع گجرات کے ایک گاؤں نوشہرہ میں آنکھ کھولی۔ محمد الیاس کے والد کا نام رحمت اللہ جبکہ والدہ کا نام فاطمہ ہے۔ ان کے والد محترم قرآن پاک کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے تھے۔ محمد الیاس والد کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "میرے والد صاحب بہت خوبصورت اور محبت کرنے والی شخصیت تھے۔ اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن بہت یاد آتے ہیں۔"[۵۲]

ان کی والدہ فاطمہ نہایت نرم دل، صابر شاکر اور محبت کرنے والی ذہین خاتون تھیں۔ ان کے معمولات میں باقاعدگی سے نماز ادا کرنا اور بلاناغہ تلاوتِ قرآن پاک شامل تھی۔ والدہ کے حوالے سے محمد الیاس کہتے ہیں:

> "اگر میری والدہ نے روایتی نصابی تعلیم حاصل کی ہوتی اور حالات انہیں مطالعہ کرنے کی مہلت دیتے تو آج ادب میں ان کا بڑا مقام ہوتا قدرت نے انہیں داستان گوئی کا سلیقہ عطا کیا تھا لوک گیت کی تہہ میں نازک خیال کو خوب سمجھتی تھیں"[۵۳]

انہوں نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ پرائمری سکول جلال پور جٹاں سے حاصل کی۔ ابتدائی جماعتوں میں اول پوزیشن حاصل کی۔ تیسری جماعت میں جوہر آباد میں قائم گورنمنٹ پرائمری سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ جہاں سے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۹۵۸ میں جوہر آباد میں امریکی امداد سے قائم ایک پُر شکوہ عمارت گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی سکول میں داخلہ لیا۔ جہاں چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۲ میں میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسی دوران محمد الیاس کو افسانہ "کفن" نے متاثر کیا۔ جس سے افسانہ نگاری کا شوق پیدا ہوا اور پہلا افسانہ لکھ ڈالا۔ ۱۹۶۴ میں پرائیویٹ ایف۔ اے کیا۔ جس کے بعد پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انڈسٹریل اکاؤنٹس راولپنڈی میں داخلہ لیا لیکن جلد ہی احساس ہو گیا کہ مزاج اکاؤنٹس کی تعلیم سے میل نہیں کھاتا اس لیے اس کو چھوڑ کر پرائیویٹ بی اے کی تیاری شروع کر دی۔ بطور پرائیویٹ امیدوار بی اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ مالی مسائل کی وجہ سے بی اے

کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع کر ہو گیاان کے افسانوی مجموعے "مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں" میں دوست خاقان ساجد لکھتے ہیں:

> "۲۲ دسمبر ۱۹۴۶ء کو گجرات میں تولد ہونے والا سات بہنوں کا اکلوتا بھائی اور منفرد کہانی کار مصوری سے گہرا شغف رکھتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں مصوری اور افسانہ نویسی شروع کی۔ غمِ روزگار نے بی اے سے آگے سلسلہ تعلیم جاری رکھنے کی اجازت نہ دی"۔[۵۴]

۱۹۷۴ء میں محمد الیاس تزئین تاباں سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ اللہ تعالی نے ان کو دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔ بیٹیاں مریم اور ماریہ اور بیٹے عارف علی ٹیپو اور حیدر علی سانول ہیں۔ حیدر علی سانول کا بون میرو کینسر کے باعث بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ "مُورتیں" میں عرفان جاوید لکھتے ہیں:

> "وہ بے انتہا لاڈلا، ہنس مکھ اور زندہ دل بچہ جب اپنی محبت کے جال میں سبھی کو بُری طرح جکڑ چُکا تو بیمار رہنے لگا۔ جلد تھک جاتا اور جسم دبوانے لگتا۔ بھوک کم ہونے لگی، وزن گر گیا اور نقاہت طاری ہونے لگی۔ ماں باپ اپنے جگر گوشے کو سینے سے لگائے در در پھرنے لگے۔ اُس کے بے شمار ٹیسٹ ہوئے۔۔۔ بالا آخر اُس معصوم کو کینسر تشخیص ہوا، بون میرو جو آخری حدود میں تھا۔[۵۵]

عملی زندگی کا آغاز ملتان میں پی ڈبلیو ڈی میں ورکس سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ نقشہ نویس کی عارضی نوکری سے کیا پھر اے جی پی آر میں ملازمت کی۔ اس کے بعد کراچی میں ہیوی ڈیوٹی والو اور پارٹس سپلائی کرنے والی نجی کمپنی میں ملازمت کی۔ بعد ازاں معدنیات کا زاتی کاروبار شروع کیا مار بل چپس کی ایکسپورٹ بھی کی۔

۲۔ ادبی تعارف

محمد الیاس نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز میٹرک میں افسانہ "بڑا باپ" لکھ کر کیا جو "شمع" کراچی میں شائع ہوا۔ ان کے ابتدائی افسانے "ڈائریکٹر" اور "شمع" میں شائع ہوتے رہے۔ محمد الیاس نے افسانہ نگاری، ناول نگاری، کالم نگاری، ڈرامہ نگاری، سفر نامہ نگاری، نظم نگاری اور سوانح عمری میں طبع آزمائی کی۔ محمد الیاس کی تصانیف درج ذیل ہیں:

ناول: کُہر، برف، بارش، پُروا، دھوپ، حبس اور افسانوی مجموعے، لوحِ ازل پہ لکھی کہانیاں ۱۹۹۵ء، مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں ۱۹۹۷ء، صدیوں پہ محیط اک سفر ۱۹۹۸ء، منظر پس غبار ۲۰۰۰ء، دوزخ میں ایک پہر ۲۰۰۵ء،

اندھیر نگری کے جگنو ۲۰۱۳ء، آئینے میں گم عکس ۲۰۱۵ء، گلیوں اور بازاروں میں ۲۰۱۶ء، کٹڑیاں چوبارے، عُقُوبتِ نفس ۲۰۱۸ء، چڑیا اداس ہیں ۲۰۱۹ء، وارے کی عورت اور دوسری کہانیاں ۲۰۱۹ء، مایا کومایا ملے (ناولٹ) ۲۰۲۰ء، سُرخ گلاب ۲۰۲۰ء، رنگ ریز (ناولٹ) زیرِ طباعت ہے۔

۳۔ محمد الیاس کی ناول نگاری

محمد الیاس معاصر ناول نگاری کا اہم نام ہے۔ ان کے ناول جہاں فن و اسلوب کی سطح پر ناول کے تقاضے پورے کرتے ہیں وہیں اپنے موضوعات کے اعتبار سے اپنی زمین اور اپنے سماج سے جڑے ہیں۔ ان کے موضوعات ارضی حقائق سے اٹھائے گئے ہیں اور انہیں بغیر کسی لگاوٹ کے اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ ناول میں سمویا گیا ہے۔ یہ تلخی لہجے کی نہیں بلکہ سماجی مسائل کی حقیقت بیانی سے ہے۔ لہجے اور لفظوں کے چناؤ میں وہ وقار اور تہذیب ہے جو اس مٹی سے اور اس کی تہذیب سے جڑے کسی بھی ادیب کے لیے ضروری ہے۔ اپنے ناولوں میں انہوں نے سماج کی عصری صورت حال کو موضوع بنایا جو ان کی عصری آگہی کے باعث اجنبی رہتی بلکہ ہماری اپنی زندگی بن جاتی ہے۔ جس کے کردار یا تو ہم خود ہیں یا ہمارے ارد گرد بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف ان کرداروں کی عملی زندگی دکھاتے ہیں بلکہ ان کے افعال کے پیچھے موجود محرکات کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ یہ محرکات، نفسیاتی، معاشی، سیاسی، مذہبی یا دیگر کسی بھی داخلی و خارجی سطح کے ہوں محمد الیاس کی گرفت سے باہر نہیں ہیں۔ ان کے ناولوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ ان کی ناول نگاری کی اجمالی تفہیم کے لیے چند موضوعات کا جائزہ لیتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام

معاشرے میں انسانی ارتقائی عمل کے ادوار کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی طور پر قدیم اشتراکیت کا دور وجود میں آیا۔ طبقاتی نظام کی ابتدا جاگیر دارانہ نظام کی وجہ سے ہوئی۔ جس کے تحت زمین اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے افرادِ معاشرہ پر ظلم و ستم کی لازوال تاریخیں رقم ہوئی ہیں۔ وطنِ عزیز میں طویل عرصہ تک جاگیر دار، سرمایہ دار اور فوجی جرنیل قابض رہے۔ اس کی وجہ سے جن حالات نے جنم لیا وہ ملکی ترقی کی راہ میں رکاوٹ رہے۔ محمد الیاس کے ناولوں کا ایک موضوع جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کا استحصال ہے۔ ناول نگار کے ناول "بارش" کا انتساب دیکھیے:

"غلام نسلوں کی نمائندہ انسان نما مخلوق ہاریوں، مزارعوں، مزدوروں، چوہڑوں، بھکاریوں اور کسبیوں کے نام جن کی خون پسینے کی کمائی، بھیک اور خرچی پر حکمران اور مراعات یافتہ طبقے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔"[۵۶]

"بارش" کے موضوع ظالمانہ استحصال کے حوالے سے محمد سلیم الرحمان لکھتے ہیں:

"بارش" مختصراً اس جاگیر دارانہ نظام کی استبدادی حیثیت، کھوکھلے پن اور معنویت رہائی کی معروضی انداز میں چیڑ پھاڑ ہے جو کسی آسیب کی طرح پاکستان کو ۱۹۴۷ء سے چمٹا ہوا ہے۔"[۵۷]

ناول "بارش" میں تاجور جاگیر دار گھرانے کا ایک ایسا کردار ہے۔ جو اپنی طاقت کے نشے میں چُور ہے۔ وہ اپنی طاقت کے بل بُوتے پر جس بہو سے چاہتی ہے۔ بچے کی پیدائش ہونے دیتی ہے اور جس بہو کو ناپسند کرتی ہے۔ اس کی کوکھ میں پلنے والا وجود دنیا میں آنے سے پہلے ہی ان کی زندگی کا چراغ گُل کر دیتی ہے۔ اس پر شہریار کی سوچ ملاحظہ کریں "گویا طاقت، دولت اور اختیار حاصل ہو تو اللہ کے اختیارات میں کھلی مداخلت کی جا سکتی ہے۔"[۵۸] اسی طرح جب شہریار بایاب سے شادی کر لیتا ہے تو تاجور سلطانہ کے ایک اشارے پر شہریار کو واپس لے آتے ہیں۔ اس وقت نایاب کا بوڑھا باپ طاقت کے سامنے بے بسی، لاچاری و مجبوری کی مثال نظر آتا ہے۔

"جس طبقے سے میں نے رشتہ جوڑنے کی کوشش کی وہ بالفعل اس عہد کا خدا ہے۔ ہم جیسوں کی ہر تدبیر ان کے سامنے سرنگوں ہے۔"[۵۹]

دوسری طرف محکومی کا یہ عالم ہے کہ غلام اپنے آقا کا ہر حکم ماننا فرض سمجھتے ہیں، اور یہ دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں کہ مالک کا ہر حکم اٹل اور ہر فعل جائز ہے۔ یہ محکومی کی جڑیں کس حد تک پیوست ہو چکی ہیں۔ ملاحظہ کریں:

"سئیں کا حکم ہی دراصل خدا کا حکم ہے۔ اس کا ہر راز سینے میں دفن کر لینا ہے۔ باپ بھی کرید کرے تو اسی سختی سے ڈانٹ دینا ہے۔ سنبھالنے میں مشکل پیش آئے تو اپنی زبان خود خود کاٹ کر راز اگلوانے والے کی ہتھیلی پر رکھ دینی ہے۔"[۶۰]

محمد الیاس محکومی کے اصل اسباب سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں محکومی کی ایک بنیاد معاشی وسائل پر کنٹرول ہے۔ جہاں وسائل کی منصفانہ تقسیم نہ ہونے کے سبب معاشرتی نظام غیر واضح اور غیر متوازن ہے۔ مثال دیکھیں:

> "سندھ کی کل زمینوں پر چالیس یا پینتالیس وڈیروں کا قبضہ ہے۔ باقی ساری دیہی آبادی، ہاری۔۔۔ان کی غلام عوام کی نفرت کا رُخ موڑنے کے لیے کبھی آباد کار کبھی مہاجر کے خلاف نعرہ دے دیا۔ خود بے فکر ہو کر عیاشی میں لگے رہے۔"[۶۱]

محمد الیاس برسوں سے قائم اس استحصالی نظام کے خلاف بر سرِ پیکار ہیں۔ وہ پاکستانی سماج کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بدلنے کے لیے نہ صرف آواز اٹھاتے ہیں۔ بلکہ اس کا حل بھی تجویز کرتے ہیں۔ ناول نگار چاہتے ہیں کہ سماج میں وسائل کی منصفانہ تقسیم ہو۔ تاکہ غربت، جہالت اور استحصالی نظام کا خاتمہ ہو۔ اس حوالے سے "بارش" میں لکھتے ہیں۔

> "کوئی انسان دوسرے کا استحصال نہ کرے۔ جھوٹ، فراڈ، غبن ندارد، انصاف سب کے لیے اور ریاستی قوانین کی پابندی سب پر لازم ہو۔ تب یہ دنیا رہنے کے قابل ہو جائے گی۔ ایسا ممکن ہے چونکہ کچھ خوبصورت انسانی معاشروں کی مثالیں روزِ روشن کی طرح واضح ہیں۔"[۶۲]

محمد الیاس نے اپنے ناولوں میں جاگیر درانہ نظام، عدم مساوات اور سرمایہ داروں کی سفاکیت کی تصویر پیش کی ہے۔ اس اقتصادی، سیاسی اور سماجی استحصال میں ایک اور حوالہ جو معاشرے میں بگاڑ کا سبب ہے وہ تعصب ہے۔ محمد الیاس نے مذہبی، نسلی، علاقائی اور لسانی تعصبات کو بھی موضوع بنایا ہے۔

تعصبات

کسی بھی نظریے یا خطے سے محبت ہونا ایک فطری امر ہے۔ لیکن اگر یہی محبت اتنی شدید ہو جائے کہ دوسروں کے نظریوں یا خطوں سے نفرت پیدا ہو جائے تو تعصب جنم لیتا ہے۔ جو معاشرے میں نفرت اور معاشرے کے امن میں بگاڑ پیدا کرتا ہے۔

مذہب، نسل، زبان اور علاقہ یہ اہم عناصر ہیں۔ جو تعصب کی بنیاد بنتے ہیں۔ موجودہ دور کی بُرائیوں میں ایک بہت بڑی برائی نسلی، لسانی، اور مذہبی تعصب ہے۔ محمد الیاس کے ناولوں کا ایک اہم موضوع مذہبی، نسلی، صوبائی اور لسانی تعصب ہے۔ ان تعصات کی بنا پر مذہبی منافرت پھیلائی جاتی ہے۔ دوسری طرف

مسلمان فرقہ پرستی کی بنیاد پر ان کے مقام و مرتبے کو پامال کرنے کے لیے مخاصمانہ مواد چھاپ کر اور پھیلا کر مذہبی منافرت پھیلا رہے ہیں۔ مثال ملاحظہ کریں:

"یزید اسلامی ریاست کا حاکمِ وقت تھا۔ حسینؓ نے اقتدار چھیننے کے لیے بغاوت کی گویا تاریخِ اسلام جو لکھی گئی غلط تھی۔ لہذا نئے سرے سے ترتیب دی جائے۔"[۶۳]

محمد الیاس مذہبی منافرت پھیلانے اور عالمِ اسلام کی عظیم ترین ہستیوں کے مقام و مرتبے کو متنازعہ بنانے والوں کی مذمت کرتے ہیں۔ محمد الیاس کے ہاں تشدد کی لہر کا بیان بھی ملتا ہے۔ سمیرا عمر لکھتی ہیں "انھوں نے مسلکی عصبیت کے اداروں کی تربیت کے نتیجے میں نوجوانوں کے ذہن اور عمل میں آنی والی شدت پسندی کو "کُہر" میں پیش کیا ہے۔"[۶۴] جب یار محمد کا بیٹا "مجاہد فورس" میں شامل ہو کیا۔ اس نے باقاعدہ عسکری تربیت حاصل کی۔ مخالف مسلک کے لوگوں پر ٹوٹ پڑنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ بالآخر اس کے ارادوں کی تکمیل ہوئی۔

"مسجد امام بارگاہ میں اٹھائیس افراد عشاء کی نماز ادا کرنے میں مشغول تھے کہ "مجاہد فورس" نے ان پر فائر کھول دیا۔ سات نمازی موقع پر ہی جہنم رسید ہوئے۔ جن میں رضا عباس بھی شامل تھا۔ جوابی حملے میں صرف ایک مجاہد جہنم رسید ہوا جو غلام عباس تھا"[۶۵]

اسی طرح مذہبی تنظیموں کی جانب سے "حبس" میں پراچہ کا قتل اندوہ ناک واقعہ ہے۔ یہ شدت پسندی اور تفرقہ بازی معاشرتی بگاڑ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی خواہشات کا گلہ بھی گھونٹ رہی ہیں۔ دُرِ شہسوار کہتی ہے:

"میں اکثر سوچتی ہوں کہ مذہب کے نام پر خلقِ خدا کے خون کی ندیاں ہی نہیں بہائی گئیں نازک انسانی جذبات کا بھی ناحق قتل ہوا ہے۔"[۶۶]

مذہبی شدت پسندی کی روک تھام کے لیے "بارش" میں دُرِ شہوار کی زبانی الیاس بیان کرتے ہیں۔

"اللہ کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک میں اللہ کی راہ میں قتال کا مقدس فریضہ روزِ اول سے جاری ہے اور یہ کبھی بند نہیں ہو گا۔ جب تک زمین پر سب لوگ ایک مذہب کے پیروکار نہ بن جائیں اور یہ ناممکن ہے قتل انسانی صرف اس روز بند ہو گا جب لوگ مذہب کے حوالے سے سوال کرنا چھوڑ دیں گے یا پھر کم از کم اسے ہر فرد کا ذاتی مسئلہ قرار دینے پر متفق ہو جائیں۔"[۶۷]

مسلکی تعصب کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں لسانی تعصب بھی پایا جاتا ہے۔ زبان سے محبت فطری جزبہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری زبانوں سے نفرت کی جائے۔ اصل میں بلاجواز کی عصبیت مسائل پیدا کرتی

ہے۔ سرائیکی اور سندھی بہت میٹھی زبانیں ہیں مگر ان سے محبت کے لیے ضروری نہیں کہ دوسری زبانوں سے نفرت کی جائے۔ محمد الیاس بھی لسانی تعصب کی نفی کرتے ہیں۔

لسانی، نسلی، صوبائی اور مذہبی تعصب کے زیرِ اثر قتل وغارت اور دہشت گردی جیسی بُرائیاں آج معاشرے میں پھیل چکی ہیں۔ الیاس کے ناول "برف" کا موضوع جہاد ہے جو افغانستان اور کشمیر میں جاری ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ جو جوانوں کو عسکری تربیت کے لیے جلسے، جلوس اور ریلیوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ان طریقوں سے نوجوانوں کو ذہنی اور جسمانی طور پر عسکری تربیت کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ ان کے اندر شہادت کا جزبہ اس حد تک پروان چڑھ جاتا ہے۔ کہ جب افغانستان سے غیر ملکی افواج کا انخلا ہوتا ہے تو یہ تربیت یافتہ نوجوان شہادت کے لیے کس قدر بے چین ہو جاتے ہیں۔

> "جامِ شہادت نوش کرنے کے متمنی متوالوں کا کیا بنے گا؟ شہادت کی حسرت دل میں لیے گھروں میں پڑے طبعی عمر پوری کریں گے۔ کاش کوئی نیا محاذ کھلے اور بچے کھچے مجاہدین بھی خوب بھر بھر کے جامِ شہادت نوش کریں۔"[۶۸]

محمد الیاس ان چہروں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ جو ان تنظیموں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ اور نوجوانوں میں نفرت اور شدتِ جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ جو قومی ہم آہنگی کے لیے نقصان کا باعث بنی۔ ناول نگار اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں ملک میں کوئی مذہبی، مسلکی اور نسلی بنیادوں پر کسی کا خون نہ کرے۔ بلکہ ہر مذہب اور ہر مکتبہ فکر کو اپنے عقائد میں آزادی ہو۔ وطنِ عزیز میں کسی کے ساتھ ظلم اور ناانصافی نہ ہو۔ پاکستان محبت اور امن کا گہوارا بن جائے۔

> "گویا محبت ہی وہ جزبہ ہے جس پر کوئی بھی معاشرہ قائم رہ سکتا ہے۔ جبر اور ظلم سے گھر، معاشرے اور ملک ٹوٹ جایا کرتے ہیں"۔[۶۹]

محبت اور امن کی فضا قائم کرنے کے لئے ضروری ہے:

> "ہمارا ایک ہی مقصد ہونا چاہیے کہ ہماری کسی بات یا عمل سے انسانی برادری میں تفرقہ پیدا نہ ہو، باہمی محبت کے جذبات فروغ پائیں۔ زمین پر فساد کا بیج بونے والا سب سے بڑا ظالم وہ ہے خواہ وہ کسی بھی مذہب کا پیروکار ہو۔"[۷۰]

محمد الیاس ہر قسم کے تعصبات کو ختم کر کے انسان دوستی اور بھائی چارے کا درس دیتے ہیں۔ یہ ایسے سماج کے خواہاں ہیں۔ جہاں عقیدے، زبان یا زمین کی بنا پر تعصب نہ ہو، تنگ نظری نہ ہو بلکہ رواداری اور کشادہ نظری

ہو۔ ایک ایسا معاشرہ تشلیل پائے۔ جہاں قومی تفاخر، لسانی تعصب اور نسلی تفریق مٹ جائے اور تمام انسانوں سے برابری کا سلوک ہو۔ محمد الیاس ان سماجی مسائل کو موضوع بناتے ہوئے جہاں انہیں اپنی اصلی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ وہاں رائج بیانیوں کو رد کرنے کے لیے طنز کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ اکثر یہ طنز ان کے ناول کے مظلوم کرداروں کے مکالمات سے جھلکتا ہے۔

طنز

اردو ادب میں طنز و مزاح ایک ایسی آڑ ہے۔ جس کے سہارے تلخ سے تلخ اور ناگفتہ سے ناگفتہ بات سہولت سے کہی جا سکتی ہے۔ اسی کا سہارا لیتے ہوئے ادیب سماج کے قبیح افعال پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ محمد الیاس بھی طنز و ظرافت کے ماہر ہیں، اور معاشرتی رویوں پر جملوں میں اتنی مہارت سے طنز کرتے ہیں کہ بندہ دیکھتا رہ جاتا ہے، پھر اچانک منہ سے قہقہے امڈ پڑتے ہیں۔ "ناول "کُہر" میں طنز کی مثال دیکھیں:

> "تم تیار ہو جاؤ۔ شام کو تمھارا نکاح ہے۔ اپنا خاندان کا لڑکی ہے۔ بہت اُونچا شان والا خاندان ہے۔ اللہ کا بہت شکر ہے کہ وہ ابھی پچھلے مہینے مہینے جوان ہو گیا ہے۔[۱]

محمد الیاس کے ہاں طنز بین السطور ہوتا ہے جو قاری کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ یہ سماج کی کھوکھلی اقدار پر طنز کرتے ہیں۔ جنھوں نے کمزوروں، غریبوں اور عورتوں کا استحصال کیا ہے۔ انھوں نے ناولوں میں طنز کے ذریعے یہ باور کروایا ہے کہ یہ اقدار کھوکھلی اور نے بنیاد ہیں، جو صرف طاقتوروں کی حاکمیت قائم کرنے کے لئے ہیں۔ "برف" میں اس کا بیان یوں کیا ہے۔

> "ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اس کی بیشتر اخلاقیات جعلی اور قدریں مصنوعی ہیں۔ کئی تہذیبوں کا مغلوبہ ہے، جہاں بزور شمشیر اپنے عقائد اور نظریات کمزوروں اور زیر دستوں پر ٹھونسے جاتے ہیں۔ حقیقی انسانی جذبوں کے منافی اخلاقی فلسفہ نافذ ہے۔"[۲]

ان موضوعات اور طنز کے پردے میں محمد الیاس سماج کو درپیش حقیقی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے معاشرہ عدم توازن کا شکار ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نگینہ جبیں، اودوناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۱۹۴۷ اوراس کے بعد، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، طبع اول ۲۰۰۲ء، ص ۲

۲۔ وارث سرہندی، علمی اردو جامع لغت، علمی کتاب خانہ کبیر سٹریٹ لاہور، ۱۹۷۹ء، ۹۵۵

۳۔ الحاج مولوی فیروزالدین، فیروزالغات اردو، فیروز سنز پرائیویٹ لاہور، باراول ۲۰۱۰ء، ص

4. The social science encyclopedia edited by Adam kuper and Jessica kuper , S5 services book club 1989, p 794

۵۔ آکسفورڈ ایڈوانس لرنر لغت، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۴ء، ص ۱۲۲۶

6. Spencer , Herbert , The principles of sociology , Vol,6, Appleton.7, 1985, P 436

۷۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۸۰

۸۔ نگینہ جبین، اردوناول کا سماجی وسیاسی مطالعہ، ۱۹۴۷ء اوراس کے بعد، ص ۲

۹۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ادبی تنقید، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء، ص ۱۳

۱۰۔ ابنِ خلدون، مقدمہ ابنِ خلدون، ترجمہ مولانا راغب رحمانی، نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی، حصہ اول، ۲۰۰۱ء، ص ۶۱

۱۱۔ شعیب عتیق خان، ڈاکٹر، اردو کے افسانوی ادب پر فسادات ۱۹۴۷ کے بعد، بیکن بک ہاؤس لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۳۔ انگریزی آکسفورڈ لیونگ لغت، ۱۲ اپریل ۲۰۲۰ء،

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، اسلام آباد، ۱۶ مئی ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۴

۱۵۔ مولوی فیروزالدین، الحاج، فیروز سنز پرائیویٹ لاہور، بارِ اول ۲۰۱۰ء، ص ۸۴۳

۱۶۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، اپر مال لاہور، جلد سوم و چہارم، ص ۱۸۱

۱۷۔ نگینہ جبین، اردو ناول کا سماجی و سیاسی مطالعہ ۱۹۴۷ اور اس کے بعد، الہ آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۶

18.Stanislaw ossowski, classstructure in the socialconsciousness, routledge,11 new fetter lane, london,1963,p-6

19.J. M. Bochenski,sovietica, d. Reidel publishing company / dordrecht – holland,1958,p55

20.Charles H. Colley , Social Consciousness Published: American Journal of Sociology,Volume, 12 issue 5, March, 1907, P 676

۲۱۔ صالحہ زریں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک، ادارہ نیا سفر، ۲۸ مرزا غالب روڈ، الہٰ آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۲۷

۲۲۔ محمد حسن، ادبی سماجیات، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء ص ۱۹

۲۳۔ اطہر حسن، مشتاق احمد یوسفی کی عصری آگہی مشمولہ : ایوانِ اردو دہلی، جلد نمبر ۳۲، شمارہ نمبر ۵، ستمبر ۲۰۱۸ء، ص ۲۴

۲۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اختلافات، مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۲۷

۲۵۔ احتشام حسین، تنقید اور عملی تنقید، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۴ء، ص ۲۱

۲۶۔ آمنہ صدیقی، افکار عبدالحق، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، اگست ۱۹۶۲، ص ۶۷

۲۷۔ مہر اختر وہاب، اردو میں اسلامی ادب کی تحریک، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۰

28 Robin M. Williams, JR," Individual and Group Values", Social Psychology: Reading and Perspective, Edited by Edgar F. Borgata, Chicago: Rand McNally and Company, 1969, P.333

29. Krech, Crutchfield, Ballachey, Individual in Society, Tokyo: Kogakusha Company, Ltd, 1962, P.102

۳۰۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، عبداللہ ہارون روڈ کراچی، آٹھویں بار ۱۹۸۹ء، ص ۴۷

۳۱۔ حسن عسکری، انسان اور آدمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۴ء، ص ۱۴۴

۳۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فنی و فکری جائزہ، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۴

۳۳۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۰۵ء، ص

۳۴۔ آل احمد سرور، بحوالہ اردو نثر کا فنی ارتقا، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۵

۳۵۔ یوسف حسین سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ترقی اردو دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۹۱

۳۶۔ احسن فاروقی و ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ناول کیا ہے، دردا کادمی لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱۵۵

۳۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر داستان اور ناول (تنقیدی مطالعہ)، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۵۱۲

۳۸۔ خورشید اسلام، تنقیدیں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۹

۳۹۔ سحر انصاری، بحوالہ "پاکستانی معاشرہ اور ادب" مترجمین ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری، احمد سلیم، پاکستان سٹڈی نیئر جامعہ کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۱

۴۰۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادبِ اردو، مترجم مرزا محمد عسکری، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۴۳۴

۴۱۔ آل احمد سرور، بحوالہ اردو نثر کا ارتقا، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، الوقار پبلی کیشنز، لاہور ص ۱۰۸

۴۲۔ طیبہ خاتون، ڈاکٹر، اردو نثر کی داستان، یمانی پرنٹرز لاہور، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۵

۴۳۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۰

۴۴۔ امجد علی شاکر، پروفیسر، اردو ادب تاریخ و تنقید، عزیز پبلیشرز لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۴۴۴

۴۵۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۶

۴۶۔ محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی اسلام آباد، ص ۱۰۸

47. Urdu scholars ki Duniya, Vol 1, Issue111, October 2013, P50

۴۸۔ روبینہ کوثر، ظفر ہرل، ڈاکٹر، آنگن کی فکری ساخت: موضوعاتی مطالعہ مشمولہ زبان وادب (شمارہ ۶۰۰)، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونی دوسٹی، فیصل آباد، ص ۱۵۵

۴۹۔ فردوس احمد بٹ، ڈاکٹر، جمیلہ ہاشمی کے تاریخی ناول، اردو ریسرچ جرنل، شمارہ ۱۳، جنوری تا مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۶۵

۵۰۔ امجد علی شاکر، ڈاکٹر، اردو ادب تاریخ و تنقید، عزیز پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۴۴۹

۵۱۔ روبینہ الماس، عبداللہ حسین کے ناولوں میں طبقاتی شعور، مشمولہ بنیاد جلد ۷، ۲۰۱۶ء، ص ۴۵۲

۵۲۔ محمد الیاس، بالمشافہ انٹرویو ۱۰ جون ۲۰۲۰، بحریہ ٹاؤن فیز ۲ راولپنڈی

۵۳۔ ایضاً

۵۴۔ خاقان ساجد، بحوالہ مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱

۵۵۔ عرفان جاوید، مُورتیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء ص ۱۰

۵۶۔ محمد الیاس، بارش، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۵۰

۵۷۔ محمد سلیم الرحمٰن، آنسوؤں کی جھڑی، مشمولہ ہفت روزہ شہری، اپریل تا مئی ۲۰۱۴ء، لاہور، ص ۴۳

58۔ محمد الیاس، بارش، ص ۴۵۰

۵۹۔ ایضاً، ص ۳۲۴

۶۰۔ ایضاً، ص ۶۵۷

۶۱۔ ایضاً، ص ۲۱۷

۶۲۔ ایضاً، ص ۸۸۷

۶۳۔ محمد الیاس، کُہر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۵۴۰

۶۴ سمیرا عمر، محمد الیاس کے ناولوں میں شدت پسندی کی پیشکش، مشمولہ دریافت، شمارہ ۲۱، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ص ۱۴۷

۶۵۔ محمد الیاس، کُہر، ص ۵۴۰

۶۶۔ محمد الیاس، بارش، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۵۷۷

۶۷۔ محمد الیاس، بارش، ص ۸۳۷

۶۸۔ محمد الیاس، برف، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۱

۶۹۔ ایضاً، ص ۵۰۹

۷۰۔ محمد الیاس، بارش، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۶۷

۷۱۔ محمد الیاس، کُہر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۳۷۶

۷۲۔ محمد الیاس، برف، ص ۹۰

باب دوم

"کہر" میں سماجی شعور اور عصری مسائل

محمد الیاس کا شمار اردو زبان و ادب کے نمائندہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اردو افسانہ اور ناول کی روایت محمد الیاس کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ ان کا فکر رسا اسلوب پُختہ نیز اپنے اندر تازہ کاری لیے ہوئے ہے یہ پاکستانی معاشرے کے سچے نباض ہیں۔ ان کے افسانے اور ناول بالخصوص پاکستانی معاشرے اور بالعموم طور پر برصغیر پاک وہند کے معاشروں کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

"کُہر" محمد الیاس کا پہلا ناول ہے۔ یہ ۲۰۰۷ میں سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ "کُہر" بہت منفرد اور دلچسپ ناول ہے۔ "کُہر" کا پلاٹ، کردار نگاری، جزئیات نگاری، تشبیہات و استعارات، فکر اور اسلوب اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ "کُہر" کہانی کی بُنت ایسی ہے کہ ایک واقعہ دوسرے واقعے کے ساتھ اس انداز میں جڑا ہوا ہے کہ کسی ایک واقعے کو کہانی سے الگ کر دینے سے قاری بے مزہ ہو کر رہ جائے۔ کہانی کا ہر موڑ دوسرے موڑ کے ساتھ جڑا ہوا ہے کہ کہیں بھی مصنوعی پیوند دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح کرداروں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول کا ہر کردار اپنی جگہ مکمل ہے۔ کردار نگاری کی تمام خوبیاں ناول کے اندر موجود ہیں۔ اگر کردار مثبت ہے تو ڈپٹی نذیر احمد کے کرداروں کی طرح مجسم نیکی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسا انسان ہے۔ جو نیک بھی ہو سکتا ہے اور اس میں گناہ بھی پنپ سکتا ہے۔ اگر کردار منفی ہے تو اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ اس میں نیکی سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ بلکہ ممکن ہے کہ وہ عام انسان کی مانند اپنی ذات میں دل کے کسی کونے کھدرے میں کوئی مثبت جذبہ بھی رکھتا ہو۔ یعنی "کُہر" کے کردار ایسے کردار ہیں۔ جو عام انسان ہیں۔ بھلائی بھی کر سکتے ہیں اور ان سے کسی منفی سرگرمی کی امید بھی رکھی جا سکتی ہے۔

محمد الیاس نے کہانی کو جاندار بنانے، پلاٹ کی پختگی، نیز کرداروں کو زندہ و جاوداں بنانے کے لئے بارہا جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ واقعات اور کرداروں کی تفصیل اس خوبی سے بیان کی ہے کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ "کُہر" ایسا ناول ہے۔ جس میں تخلیق کی دیگر خوبیوں کے علاوہ منظر نگاری خاص لطف کی حامل ہے۔ کرشن چندر کے ناولوں میں جس طرح منظر نگاری اپنی جُزئیات کے ساتھ ملتی ہے۔ یہاں بھی اسی طرح موجود ہے۔ کبھی کبھی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے محمد الیاس بھی مستنصر حسین تارڈ کی مانند فطرت شناس ہے۔ جس طرح مستنصر حسین تارڈ فطرت کے حسن میں کھو جاتا ہے اور پڑھنے والا منظر میں گرتی برف کو

اپنے اندر گرتا محسوس کرتا ہے۔ ایسے ہی ان کے ناول میں کئی مقامات پر کئی مقامات پر منظر نگاری کے عجب لطف سے محظوظ ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب کہانی کے دو کردار جلال اور کبوتری گلگت کے سفر پر نکلتے ہیں۔ تب ناول نگار شمالی علاقہ جات کے حسن کو اپنے جادوئی قلم سے یوں تحریر کرتا ہے۔ کہ قاری خود اس حسن کے سحر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس ناول کا اسلوب بھی تازہ کاری لیے ہوئے ہے۔ کہیں سنجیدہ کہیں فلسفیانہ۔ لیکن اس حد تک فلسفیانہ نہیں کہ قاری اکتا جائے۔ جہاں کہیں اسلوب بوجھل ہونے لگتا ہے وہاں ہلکی پُھلکی ظرافت کا رس اسے لطیف بنا دیتا ہے۔ علم بیان و بدیع کا ہُنر ناول نگار کو خُوب آتا ہے۔ وہ اسے بیان کرنے سے چوکتا بھی نہیں۔ سنجیدہ قاری کسی مقام پر بھی ناول پڑھتے ہوئے بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔ اسلوب کا لطف اپنی جگہ حیات بخش ہے۔

"کُہر" کا موضوعی جائزہ

خان اسلم ۱۹۴۷ء میں امرتسر سے اپنی شریکِ حیات کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان پہنچا۔ یہاں پہنچ کر خان اسلم مہاجر کہلایا۔ جو لُٹا پٹا یہاں پہنچا تھا۔ اس نے یہاں پہنچ کر محنت کی اور ابن الوقت بننے کا گُر سیکھ لیا۔ پاکستان کے جس شہر میں اسے حویلی الاٹ ہوئی وہ بہت بڑا شہر نہ تھا۔ یہ حویلی دیوان چند کے نام سے معروف تھی۔ اسلم مہاجر کے لیے یہ نیا تھا۔ اسے جو زمین الاٹ ہوئی تھی اس پر کچھ لوگ قابض تھے۔ چنانچہ اسے کسی ایسے شخص کی مدد درکار تھی۔ جو نہ صرف معاشرے میں عزت کا مقام رکھتا ہو بلکہ طاقت ور بھی ہو۔ اسلم مہاجر نے شہر کا اور اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ اسے ایک ایسا شخص مل گیا جس کا شخص کا نام پاکھڑا تھا۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور پہلوان رہا تھا۔ پاکھڑا پہلوان کا تعلق عیسائی خاندان سے تھا۔ خان اسلم نے اس سے درخواست کی کہ وہ کرائے کا مکان چھوڑ کر اس کی حویلی میں اپنے خاندان کے ہمراہ منتقل ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنی شریک حیات اور اپنی بیٹیوں کے ساتھ حویلی میں منتقل ہو گیا۔ اس کے ہمراہ اس کی بڑی بیٹی مارگریٹ بھی تھی۔ اسلم کا ایک بیٹا بھی تھا۔ جو مارگریٹ سے چھوٹا تھا۔ اس کا نام اکرم ذوالقرنین تھا۔ مارگریٹ اس سے بے حد پیار کرتی تھی۔ اسے نہلاتی، کپڑے پہناتی اور جھولے جھولاتی۔ اسلم مہاجر کی بیوی جب یہ دیکھتی تو بہت خوش ہوتی۔ پاکھڑا پہلوان نے بہت سی زمینوں پر قابض لوگوں کو نکال باہر کیا۔ یہ زمینیں اسلم مہاجر کو الاٹ ہوئی تھیں۔ اس نے اسی غرض سے پاکھڑا پہلوان کو اپنے پاس رکھا تھا۔ اسلم مہاجر کی بیوی زرینہ نے شروع دن سے پاکھڑا پہلوان کو اپنا بھائی بنا لیا اور کہا کہ اس کی شکل اپنے بھائی جیسی ہے۔ یوں ان میاں بیوی نے پاکھڑا پہلوان کو

جزباتی طور پر بلیک میل کیا۔ جب لوگوں سے زمین واگزار ہو گئی اور مقصد پورا ہو گیا تو دونوں میاں بیوی نے پاکھڑا اور اس کے خاندان سے نظریں پھیرنا شروع کر دیں۔ اب پاکھڑا پہلوان اسلم کی نظر میں چوہڑا ہو گیا تھا مہاجر اب اسلم مہاجر نہ تھا بلکہ خان اسلم تھا۔ اس کے پاس بے پناہ دولت آگئی تھی۔ اسی طرح وہ جس حویلی میں رہتا تھا وہ حویلی نہیں بلکہ خان ہاؤس کہلاتی تھی۔ خان اسلم کو اب پاکھڑا پہلوان کی رتی بھر بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے آخر ایک دن اس نے پاکھڑا پہلوان اور اس کے خاندان کو تو حیلوں بہانوں سے حویلی سے نکال کر دیا۔ اس دوران اکرم ذوالقرنین کو مارگریٹ سے اس حد تک اُنس ہو گیا کہ وہ رات دن اسی کے نام کے وظیفے پڑتا۔ یہ بات خان اسلم اور اس کی بیوی کیلئے صدمے کا باعث تھی۔ ان کے نزدیک وہ عیسائی ہے اور چُوہڑے تھے۔ اکرم ذوالقرنین کے سکول کا نام اسلامیہ ہائی سکول تھا۔ یہ ایک نیک شخصیت سید ولایت حسین شاہ کی ملکیت تھا۔ اسی سکول میں جلال اور اکرم ذوالقرنین کی ملاقات تب ہوئی، جب یہ دونوں پانچویں جماعت کے وظیفے کے امتحان میں آگے پیچھے ایک ہی قطار میں بیٹھے تھے۔ بعد ازاں دونوں کی دوستی بہت مضبوط ہو گئی۔ جلال ایک خٹک پٹھان کی اولاد تھا۔ خان اسلم کو یہ دوستی بھی پسند نہ تھی۔ دونوں دوست بالآخر تعلیمی سفر طے کرتے ہوئے کالج میں داخل ہو گئے۔ سکول کی تعلیم کے دوران ہی خان اسلم نے اکرم کا پیچھا مارگریٹ سے چھڑانے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی غرض سے اس نے اپنے بیٹے کو مری ایک سکول میں داخل کروا دیا۔ یہاں جب اکرم ذوالقرنین نے اپنے دوستوں کو مارگریٹ کے بارے میں بتایا جسے پیار سے وہ میگی کہتا تھا۔ انہوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ چنانچہ یہ ان سب کو ناپسند کرنے لگا اور خود کو اپنی ذات تک محدود کر لیا۔ یہی نہیں اس نے مارگریٹ سے خطوط کا تبادلہ شروع کر دیا اور سکول سے اکتا گیا۔ بلا آخر اس نے سکول کو خیر آباد کہا اور والدین کے ساتھ اپنے شہر کو روانہ ہو گیا۔ جلال، اکرم، شفیع کامریٹ نئیر اور خالد ملک ایک ہی کالج میں سالِ اول میں داخل ہوئے۔ خالد ملک کے علاوہ یہ سارے طالب علم ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست بن گئے۔ خالد ملک کسی قصباتی کالج سے مائیگریشن کروا کر اس کالج میں آیا تھا۔ اس میں تکبر، غرور اور خود پسندی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ انسان کو اس کے علم، شرافت اور اخلاقیات سے ناپنے کی بجائے اس کی ذات پات سے ناپنے کا پیمانہ رکھتا تھا۔ سب دوست اس سے نفریق تھے۔ اس کی ایک عادت تھی کہ وہ جس بھی بڑے شخص کو دیکھتا تو ہزار حیلوں واسطوں سے اپنا تعلق جوڑنے کی کوشش کرتا۔

اس کہانی کا ایک رُخ رومانوی پہلو ہے۔ اکرم اور مارگریٹ بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔ بالآخر یہ دوستی محبت پر منتج ہوئی۔ اکرم مارگریٹ کو پیار سے میگی جبکہ مارگریٹ اکرم کو پیار سے نین کہنے لگی۔ خان اسلم

کو اکرم اور مارگریٹ کی یہ دوستی پہلے ہی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انہیں ہر لمحہ اپنے سماجی مقام مرتبے کا خیال رہتا ۔ خان اسلم کی شریک حیات کے نزدیک یعنی زرینہ کے نزدیک دراصل یہ صلیبی جنگ تھی۔ دراصل ان دنوں ایک شخص پیر کے روپ میں وارد تھا۔ اس کی بیوی سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی زرینہ کے پاس آنے لگی۔ جب اسے زرینہ کی کمزوری کا پتا چل گیا تو اس نے بتایا کہ ہمارے مرشد نے حساب کتاب لگا کر بتایا ہے کہ اکرم پر سخت جادو کیا گیا ہے۔ یہ چالاک خاتون شہر کے تمام امیر گھروں میں جاتی اور وہاں سے کئی ایسے کیسز اس نے تلاش کر لیے۔ جو جادو ٹونے پر یقین رکھنے والی خواتین کے تھے۔ کسی کو بیٹے کی خواہش تھی۔ کسی کا کوئی کام رکا ہوا تھا۔ اس نے مختلف مسائل میں جکڑی توہم پرست عورتوں کو اس نے اپنے جال میں پھنسالیا اور ایک ڈائری مرتب کی۔ جس میں اس نے ان کے ٹیلی فون نمبر درج تھے۔

پاکپتن میں میلے کے دوران کسی کا ایک معذور بچہ گم ہو گیا تھا۔ جو قد کاٹ میں اچھی خاصی ڈیل ڈول کا حامل تھا۔ رنگ اس کا حد سے زیادہ سفیدی مائل تھا۔ وہ بچہ ایک میاں بیوی کے ہتھے چڑھ گیا جو اسے بھگا کر شہر میں لے آئے۔ جہاں ایک انتہائی تاریک گلی کے نکڑ پر ایک مکان میں اسے رکھ لیا۔ وہ بچہ ہوں ہاں کرتا تھا۔ زیادہ بول نہیں سکتا تھا۔ اس کے بس دو ہی شوق تھے۔ ایک ریزر اور دوسرا دوسرا چاندنی کے ورق اپنے پاس رکھنا۔ ریزر سے دن رات نے وہ پنڈلیاں صاف کرتا تھا۔ اسے ان میاں بیوی نے پیر بگا کے نام سے متعارف کروایا۔ جو بھی نیا شکار ان کے ہتھے چڑھتا اس سے دو چار دفعہ رقم اینٹھے کے بعد بالآخر پیر بگا کے حضور پیش کیا جاتا خاتون کا خاوند ایک منٹ کے لیے پیر بگا کے پاس بیٹھ جاتا اور اس کا ترجمان بن جاتا۔ وہ جو ہوں ہاں کرتا اس کے معانی و مفاہیم آنے والوں کو بتا دیتا۔ یہ وہی خاتون تھی جو زرینہ کے پاس آیا جایا کرتی تھی۔ یہ بہت ہی بے شرم، بے حیا اور سفلہ فطرت تھی۔ بالکل ایسا ہی اس کا شوہر تھا۔ یہ خواتین کو ایک ایک کر کے بلاتی۔ کسی ایک خاتون کا ایک دن مقرر کیا ہوتا اور اسے برفی کھلا دیتے۔ جس میں نشہ ہوتا اور پھر خاتون بے ہوش ہو جاتی۔ بے ہوشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بیوی کے سامنے اس سے مشق ستم کرتا۔ بگا پیر ہمیشہ چاندنی کے ورق پاس رکھتا تھا۔ اس کا شوہر ان خواتین کے برہنہ حصوں پر چاندنی کے ورق لگاتا چلا جاتا۔ یہ شخص اور اس کی بیوی ان کے برہنہ فوٹو بنا لیتے اور بعد ازاں اسے بلیک میل کرتے۔ آخر کار ایک وقت ایسا آیا کہ بگا پیر کسی غضبناکی کے زیر اثر اس خاتون کے شوہر کے ایزائے رسائی پر جلتی ہوئی لکڑی سے حملہ آور ہوا۔ اس توہم پرستی کا ڈھونگ طشت از بام ہو گیا۔ جب معاملہ پولیس تک پہنچا تو وہ میاں بیوی بھاگ گئے اور بگا پیر کسی طرح سے اپنے والدین تک پہنچ گیا۔

کہانی یوں ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ اکرم ذوالقرنین اوراس کے والدین کے درمیان فاصلے بڑھنے لگے دونوں کے نظریات کا ٹکراؤشدومد سے بڑھتاچلا گیا۔ خان اسلم اوراس کی شریک حیات زرینہ عمرہ پر چلے گئے ۔ ان کی مذہبی عبادات بڑھتی جارہی تھیں۔ جب یہ دونوں میاں بیوی عمرہ پر گئے ہوئے تھے۔ تب اکرم ذوالقرنین اور جلال ایک دن اپنے سردار ملک خدابخش کے گھر اس سے ملنے چلے گئے۔ اس کی بیٹی کلثوم اپنے باپ کے ساتھ بارہاخان ہاوس آچکی تھی۔ وہ اکرم پر دل ہار بیٹھی۔ جب یہ لوگ پہنچے تواس نے جھوٹ بولا کہ اس کاوالد آنے کو ہے۔ یہ لوگ اس کا انتظار کریں۔ جلال سمجھ گیا کہ کلثوم اکرم پر بری طرح سے فریفتہ ہو گئی ہے۔ چنانچہ بہانے سے وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ کلثوم اوراکرم ذوالقرنین کی وہ شب ان کے لیے سرمایہ حیات بن گئی۔

دوسری طرف جلال جس نے فوج میں کمیشن حاصل کیا تھا۔ اپنے آدرش نہ چھپانہ سکا۔ آزادی رائے نیز نسل انسانی کے حقوق کا فلسفہ اس کے گلے پڑااور فوج سے جلد برخاست ہو کر گھر واپس آگیا۔ اس کے والد خان بابااس کی شادی عائشہ نامی ایک لڑکی سے کرناچاہتے تھے۔ جس کی عمر جلال کی بہ نسبت آدھی سے بھی کم تھی۔ جلال کو یہ بات کسی صورت ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی دکھی دل لئے ہوئے تھا کہ اس کے والد خان بابانے بڑھاپے میں بنوں کی ایک سولہ سالہ لڑکی سے بیاہ رچالیا تھا۔ خان بابا کسی صورت ٹلنے والا نہ تھا۔ چنانچہ جلال نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ وہ جنگ میں کفار سے برسرِپیکار رہا ہے۔ اس لیے شادی کے قابل نہیں رہا۔ خان بابا کو بہت بہت دکھ ہوااور بیٹے کے ساتھ ہمدردی ہونے لگی۔ لیکن اس کے تھوڑے عرصے بعد کا قصہ ہے کہ پرانے قلعے میں رہنے والے دوباپ بیٹی جو سیاسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ جنہیں اس بات کا علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی بیٹی کے ساتھ جلال کا تعلق قائم ہو گیا۔ جس کا نام کبوتری ہے۔ یہ قلعہ میں پیشہ کرتی تھی۔ جلال اس کے ہاں آنے جانے لگ گیا۔ کبوتری جلال کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو گئی۔ اس نے پیشہ چھوڑ دیااور دونوں شمالی علاقہ جات کے سفر پر نکل گئے۔ جلال کی جیب میں کچھ نہ تھا۔ لیکن کبوتری کے پاس بارہ تولے سونا تھا۔ اس نے سب کچھ بیچ ڈالا کبوتری اور جلال شمالی علاقہ جات کی سیر کرتے رہے۔ کبوتری نے پہلی وفعہ برف پوش وادیاں دیکھی تھیں۔ ایک تو حسین مناظر دوسری طرف محبوب ساتھ۔ اس کے لیے گویاشادی مرگ کا بہانہ بنی ہوئی تھی۔

جلال کے وہاں نکلنے سے قبل جلال اوراکرم نے صابن بنانے کا کاروبار کیا تھا۔ نیز گُڑ اور چنے منگوا رکھے تھے۔ یہ سب کچھ اس نے ایک خاتون سے حویلی کرائے پر لے کر رکھے۔ اس خاتون کا تعلق بنوں سے تھا۔

جس کا ایک بیٹا اور اس شوہر مرحوم شیخ صاحب دنیا سے سُدھار چکے تھے۔ سیر کے دنوں میں بارش برستی رہی اور اس کے نتیجے میں صابن سے متعلقہ تمام اشیاء پانی میں بہہ گئیں۔ مزید برآں گڑ بھی پگھل گیا اور چنے گل گئے یہ سب کچھ حویلی کے پانی میں بہہ گیا۔ اس سے ایسی سر انڈا اٹھنے لگی کہ پورا محلہ غصے کا شکار ہو گیا۔ بلا آخر شیخ کی بیوہ جلال کے والد کے پاس گئی۔ ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ اس کے والد نے مزدور بھیجے۔ جنھوں نے سارا گند اٹھا کر شہر سے باہر پھینک دیا۔ جلال اور کبوتری کی عدم موجودگی میں کبوتری کا باپ خان بابا کے پاس پہنچا۔ اسے بتایا کہ اس کا بیٹا جلال میری بیٹی کو بھگا کر لے گیا ہے۔ خان بابا اس کی بات یہ ماننے کو کسی صورت تیار نہ ہوا اسے ذدوکوب کیا اور وہاں سے بھگا دیا۔ جس وقت جلال اور کبوتری لوٹ آئے تو دونوں کو عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ جلال کے چھوٹے بھائی نے اسے کبوتری کے والد کی آمد سے آگاہ کر دیا۔ دوسری طرف کاروبار کی بربادی کا قصہ سنایا۔

جب کبوتری قلعے میں پہنچی تو اس کے باپ نے اس سے اور تو کچھ نہ پوچھا۔ بس دریافت کرنے لگا کہ وہ ڈیڑھ مہینے میں جتنی کمائی کر کے لائی ہے اسے باپ کے حوالے کر دے۔ کبوتری پہلے ہی بڑی رنجیدہ تھی۔ اس کی باپ کے ساتھ تلخ کلامی ہو گئی۔ باپ لاٹھی لے کر کبوتری پر حملہ آور ہوا۔ کبوتری نے لاٹھی چھین لی اور پلٹ کر باپ پر وار کیا یہاں تک کہ اسے لاٹھیاں مار کر قتل کر ڈالا۔ خود تھانے پہنچ کر اقبالِ جرم کر لیا۔ یوں اسے چھ ماہ قید ہو گئی۔ جلال کے لئے یہ نئی پریشانی آن پڑی۔ اس صورتحال سے بنوں کہ ساکھی بیوہ کو ایک ملازم نے آگاہ کر دیا۔ اس نے جلال خان کو بلا بھیجا اور جلال خان سے کہا اگر وہ اس سے شادی کر لے تو وہ سارا قرض چکا دے گی۔ یہ معاہدہ تین سال کے لئے تھا۔ جلال خان نے نہ چاہتے ہوئے بھی شیخ مرحوم کی بیوہ سے شادی کر لی۔

زرینہ اور خان اسلم جب عمرے سے لوٹے تو زرینہ کی بہن کی بیٹی نگار اپنی ماں کے ساتھ ملنے کے لئے خان اسلم کے گھر آئے۔ نگار اور اس کی والدہ برطانیہ میں رہائش پذیر تھے۔ ان تک مارگریٹ اور اکرم کی داستان پہنچ چکی تھی۔ نگار بہت پہلے ہی ان دونوں سے جذباتی طور پر وابستہ ہو گئی۔ نگار نے خواہش ظاہر کی کہ اکرم اسے مارگریٹ سے ملوائے۔ جب تینوں کی ملاقات ہوئی تو نگار مارگریٹ سے بہت متاثر ہوئی۔ اس نے واپس جا کر نگار اور اس کے خاندان کو اپنے ہاں بلانے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اکرم ذوالقرنین کے عشق میں بھی مبتلا ہو گی۔ اس نے اکرم کو یقین دلا دیا کہ وہ چاہے تو بعد ازاں مارگریٹ سے شادی کر سکتا ہے۔ یوں وہ واپس برطانیہ چلی گئی۔ اپنے وعدے کے بموجب نگار نے پاکھڑا پہلوان اور اس کی بیٹیوں کو نہ

صرف اپنے پاس بلا لیا بلکہ کام بھی لگوا دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد پاکھڑا اس کی بیوی ایلس اور باقی خاندان ماسوائے مارگریٹ کے برطانیہ سدھار گیا۔ کچھ عرصے بعد مارگریٹ کی بہنوں نے مارگریٹ کو بھی برطانیہ بلوالیا مارگریٹ نے جس دن روانہ ہونا تھا۔ اس نے اکرم کو بلوایا اور نکاح کی پیشکش کی۔ دونوں نے عدالت جا کر نکاح کر لیا۔ دراصل اس سے پہلے اکرم اور مارگریٹ شب بسری کر چکے تھے۔ مارگریٹ چاہتی تھی کہ اس کا ہونے والا بچہ والد کا نام پالے۔ دوسری طرف اکرم اور نگار کی شادی ہو گئی۔ نگار نے اکرم کو بہت پیار دیا۔ لیکن وہ یہ بھول گئی کہ اس نے اکرم اور مارگریٹ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان دونوں کا ملن کروا دے گی۔ اس نے طریقے سے ہی پاکھڑا پہلوان اور اس کے خاندان کو برطانیہ منتقل کروا دیا تھا۔ بعد ازاں وہ اکرم کو لے کر برطانیہ چلی گئی۔ اکرم اداس تھا کہ کب وہ مارگریٹ سے ملتا ہے۔ وہ اسی امید پر برطانیہ گیا تھا لیکن نگار کسی صورت نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ملاقات مارگریٹ سے ہو۔ آخر کار پیار تلخیوں میں بدل گیا اور اکرم کو ایک شام یہ بتانا پڑا کہ اس نے مارگریٹ سے نکاح کو لیا ہے۔ اگلی صبح نگار اور اس کی والدہ نے اکرم کو گھر سے نکال دیا۔ وہ جیسے تیسے پاکستان پہنچا۔ اس کا اعتبار دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے ماں باپ اپنے کے قول و فعل میں تضاد کا بھیانک کھیل دیکھتا آیا تھا۔ نگار کے تضاد نے اسے اور بھی رنجیدہ خاطر کر دیا۔ خان ہاؤس سے دور خان اسلم کی زمینوں پر اس نے ایک حویلی میں مستقل ٹھکانہ بنالیا۔ جس کا نام اس نے ویلڈرنٹ رکھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ یہاں پر زندگی گزار رہا تھا۔

خالد ملک بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایک محکمے میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اس کی رعونت، تکبر اور غرور آسمان کو چھونے لگا۔ ایک طرف وہ پابندِ صوم و صلوۃ تھا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی باتیں کرتا تھا۔ نیکی اور بھلائی کے درس دیتا۔ دوسری طرف وہ انسانوں کے درمیان ذات پات کے نظام کا حد سے زیادہ قائل تھا۔ انسانوں کی عزت اور تکریم کرنے کے لئے اس کے پاس صرف اور صرف ایک ہی پیمانہ تھا۔ وہ پیمانہ تھا کہ متعلقہ شخص کس خاندان یا برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ خالد ملک نے اپنی بیوی کی زندگی اجیرن بنا کے رکھ دی تھی۔ وہ حد سے زیادہ حسین تھی۔ اس کا شوہر خالد ملک حد سے زیادہ بدصورت۔ خالد کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کلثوم کسی اور مرد سے اپنے تعلقات استوار نہ کر لے۔ چنانچہ گھر سے نکلتے ہوئے وہ ہمیشہ دروازے پر تالے لگا کر جاتا۔ ٹیلی فون بھی تالا بند تھا۔ کلثوم کو اڑوس پڑوس میں کسی سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کے علاوہ کلثوم چاہے یا نہ چاہے وہ لازمی ہر روز وظیفہ زوجیت ضرور ادا کرتا۔ کلثوم کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ اسے اپنا محبوب اکرم یاد آتا۔ اس نے اپنی تمام تر توجہ عبادت کی جانب مرکوز کر لی۔ خالد ملک کی ہر بات کو نظر انداز کر دیتی۔ خالد ملک

کو اس بات سے چڑ تھی۔ خالد کے نزدیک کلثوم کا تعلق ایک معمولی گھرانے سے تھا۔ اس کا والد مائنز پر ایک معمولی میٹ تھا۔ خالد ملک اعلی خاندان سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے حکومتی عہدے پر فائز تھا اس بات نے خالد ملک کے اندر اتنی رعونت بھر دی کہ وہ اپنی خوبصورت اور معصوم شریکِ حیات کو چھڑی سے مارنے سے بھی باز نہ آتا۔

جب خالد ملک کہیں دورے پر جاتا تو وہ اپنی جگہ اپنے ماں باپ کو کلثوم کے ہاں ٹھہرا جاتا تھا۔ کلثوم بہت ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ کسی بھی صورت اپنے محبوب کو اپنے ہاں بلانا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے خوبصورت لباس پہنا۔ میک کر کے سجی سنوری اور اکرم کو بلا بھیجا۔ باپ کو کسی نشے کے زیر اثر گہری نیند سلانے کا بندوبست کر چکی تھی۔ نو بجے اکرم نے آنا تھا۔ لیکن اسی دن خالد ملک لوٹ آیا۔ اس سے کلثوم کی امیدوں پر پانی پڑ گیا۔ اسے فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر نو بجے اکرم آگیا تو کیا بنے گا۔ دوسری طرف خالد ملک چہرہ شناس نہیں تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے خواہ مخواہ کی تلخی مول لے لی۔ وظیفہ زوجیت کی باقاعدگی کی وجہ سے وہ بیمار رہنے لگا۔ اس کا سانس پھول جاتا اور وہ ان ہیلر استعمال کرتا تھا۔ اس دن لڑائی کے دوران اس کی سانس اکھڑ گئی۔ وہ کلثوم کو مارنا چاہتا تھا۔ کلثوم نے موقع غنیمت جانا اور اس کے منہ پر کپڑا دے کر اسے قتل کر دیا۔ اس کے قتل پر اسے رتی بھر دکھ نہ تھا۔ لاش کو بیڈ کے نیچے پھینکنے کے بعد وہ اکرم کا انتظار کرنے لگی۔ اکرم آیا اور انہوں نے زندگی کی ایک اور بہت حسین شب بتائی۔ اگلی صبح اکرم کے چلے جانے کے بعد کلثوم نے ہر کہیں اپنے شوہر کی موت کی خبر پہنچائی۔ خالد ملک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سو گیا۔ کچھ عرصے بعد کلثوم اکرم کے بچے کی ماں بن گئی۔ بیٹے کے چہرے پر دو تل واضح تھے۔ جیسا کہ اس کے محبوب کے چہرے پر دکھائی دیتے تھے۔

جلال خان کبوتری سے ملنے جیل جایا کرتا تھا۔ جیل سپریڈنٹ کا نام سید نجم الحسن تھا۔ یہ کسی زمانے میں لیکچرار رہے تھے۔ انھوں نے ہی اپنے طلباء کو قائد عوام کے آدرش بانٹے تھے۔ سید نجم الحسن نے جلد ہی اپنا قبلہ درست کیا۔ مقابلے کا امتحان دیا اور جیل سپریڈنٹ بن گئے۔ جلال اور اس کے دوست گل شیر نے نجم الحسن سے ملاقات کی۔ انہیں خاص طور پر کبوتری کے بارے میں آگاہ کیا۔ سید نجم الحسن نے کبوتری کی اچھی خاصی حفاظت کا حکم دیا۔ بعد میں کبوتری کو انہوں نے اپنے گھر میں کام کاج کے لیے رکھ لیا۔

جلال خان ایک ہندو ماں کا بیٹا تھا۔ جسے ۱۹۴۷ میں کشمیر مہم کے دوران خان بابا اٹھا لایا تھا۔ جلال خان کے نانا نانی کو جلال خان کی ماں کے سامنے چھرے سے ذبح کر دیا۔ ان کی بیٹی کو بھگا لایا جو کم سن تھی۔ ڈرا دھمکا کر اسے مسلمان کیا اور پھر اس کے ساتھ شادی رچالی۔ ایک سال بعد وہ لڑکی ایک بیٹے اور بیٹی کو جنم دینے کے

بعد جاں بحق ہو گئی۔ خان بابا آخری عمر تک بڑے فخر سے کہا کرتا تھا کہ اس نے ایک کافر لڑکی کو مسلمان بنانے کا ثواب کمایا ہے۔ جلال کو رہ رہ کر اپنی مظلوم ماں کی یاد ستاتی۔ خان بابا جلال کی شادی تو نہ کر پایا۔ لیکن اس کی بہن کی شادی کوئلے کی کان کے ایک کارکن سے کر دی۔ جلال خان کو اپنی بہن کی بے بسی کا دکھ تھا۔ اس کے خیال میں خان بابا نے ظلم کیا تھا۔ اس کی خوبصورت بہن جو کشمیری ماں کے بطن سے تھی۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک کالے مرد کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے ہر طرف سے تھک ہار کر بلا آخر فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بہن کو لے کر ملک سے فرار ہو جائے۔

دوسری طرف اس کی شیخ صاحب کی بیوہ کے ساتھ ان بن ہو گئی۔ اس کی دو بیٹیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ وہ اپنی بیساکھی بیوی کو طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا اور اپنی بہن کا پاسپورٹ بنوایا۔ بہن کو لیا اور رات کے اندھیرے میں فرار ہو گیا۔ صبح بہن گھر میں موجود نہیں تھی۔ شور مچ گیا کہ وہ کہاں گئی؟ خان بابا اپنے بیٹوں کو لے کر اس کی بیوی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس نے بتا دیا کہ میں نے جلال خان کی جیب میں پاسپورٹ دیکھے تھے۔ جلال خان کا خیال تھا کہ اس کا باپ اور بھائی اسے اور اس کی بہن کو شہر میں ڈھونڈتے پھریں گے۔ وہ اتنی دیر میں ملک سے فرار ہو جائے گا۔ لیکن اس کے کئے کرائے پر اس کی بیوی نے پانی پھیر دیا۔ خان بابا نے ائیر پورٹ پر جاسوسی کا نظام لگایا۔ جب جلال اور اس کی بہن ایئرپورٹ پہنچے تو دھر لیے گئے۔ جلال خان کو خان بابا کے حضور پیش کیا گیا۔ اس نے جلال کے قتل کا حکم صادر کیا۔ فیض بخش جو اس کا بہنوئی تھا نیز اس کا سوتیلا بھائی گلزار اسے گھسیٹ کر باہر لایا۔ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اسے قتل کر دیا۔

جلال خان کے قتل سے پہلے کلثوم کا قتل ہوا تھا۔ وہ اس بات سے آگاہ ہو گئی تھی کہ اس کے بیٹے کو اور اسے سسرالی لے جائیں گے۔ وہ خالد ملک سے ہی نفرت نہ کرتی تھی۔ بلکہ اس کے پورے خاندان سے نفرت کرتی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ بیٹے کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دے۔ اس نے ایک شام اکرم سے رابطہ کیا اس نے بتایا کہ وہ راولپنڈی مارگریٹ سے ملنے جا رہا ہے۔ چنانچہ کلثوم نے اگلی صبح اس کے ساتھ چلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یوں کلثوم، اکرم اور ان کا بیٹا راولپنڈی پہنچے۔ اس نے اپنا بیٹا مارگریٹ کے حوالے کیا۔ اس سے پہلے وہ اکرم کی بیٹی سارا کی ماں بن چکی تھی۔ بعد میں دونوں کے ہاں ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔ کلثوم کے بیٹے نے بلا حیل و حجت مارگریٹ کا دودھ پینا شروع کر دیا۔ وہ اس بچے کو لے کر کینیڈا چلی گئی۔ کیونکہ اس کا خاندان برطانیہ سے ہجرت کر کے کینیڈا جا مقیم ہوا تھا۔ کلثوم اکرم کے ساتھ لوٹ آئی۔ شہر پہنچ کر اکرم نے اسے اپنی گاڑی سے اتارا۔ جب کلثوم گھر پہنچی تو گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کے سسرالی اور میکے والے دونوں وہاں موجود تھے۔ اس

سے پہلے اس پر پہرا لگایا گیا تھا کہ وہ کس سے ملتی اور کہاں جاتی ہے۔ اکرم نے ایک گفتگو کے دوران اسے کہا تھا تمہارا بیٹا بھی میرے ساتھ ہے۔ یہ بات جاسوسی کرنے والے شخص نے سن لی۔ اس نے خالد ملک کے خاندان کو بھی بتادی۔ اب یہ بات کھل گئی تھی کہ خالد ملک کی موت کی ذمہ داری کلثوم ہے۔ جب وہ پہنچی تو دونوں خاندانوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کلثوم کو دبوچ لیا۔ گلا دبا کر مار ڈالا۔

بابو غلام حسین اعزازی طور پر ریٹائر ہونے والے کپتان کے بیٹے ہیں۔ ایک ڈاک خانے میں تار بھیجنے نیز ٹائپنگ کا کام کرتے ہیں۔ یہ اسی زمانے کا قصہ ہے جب شہر کے طاقتور سیاستدان اور امیر خاندان خان بہادر کی ایک بہت حسین لڑکی بابو غلام حسین پر مرمٹتی ہے۔ خان بہادر اپنی بیٹی کی ضد کی وجہ سے رشتہ بھیج دیتے ہیں لیکن بابو غلام حسین انکار کر دیتا ہے۔ وہ لڑکی خود چل کر بابو غلام حسین کی ماں کے پاس آتی ہے۔ اس سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اس بات کو نہ صرف راز میں رکھے۔ بلکہ وہ اس کی شادی بابو غلام حسین کے ساتھ کر وادے۔ بابو غلام حسین ماں باپ کے دباؤ ڈالنے کے باوجود انکاری ہو جاتے ہیں۔ جب اس کے والد ریٹائر کپتان ڈاکخانے آکر ان کے دوستوں اور ہم کاروں کے ذریعے زور ڈالتے ہیں، تب بابو غلام حسین صاف بتا دیتے ہیں کہ انہوں نے لڑکی کے باپ کو آزادی کے زمانے میں ایک دریا کے کنارے مظلوم اور بے آسرا خاندان کو قتل کرتے ہوئے دیکھا۔ لڑکی کا باپ اور چچا ایک خاتون پریت کور کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے بچے کو اٹھا کر فضا میں اچھال دیتے ہیں کہ مرتا ہے تو مر جائے۔ وہاں یار محمد نامی ایک مسلمان اس بچے کو ہوا میں ہی پکڑ لیتا ہے۔ پریت کور ایک اوزار سے ان کے ایک بھائی کو قتل کر دیتی ہے۔ دوسرے کو مارنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک لڑکی کے باپ پر وار ہونے سے ایک ہونٹ کٹ جاتا ہے جو ابھی بھی کٹا ہوا ہے۔ غلام حسین کہتا ہے وہ کیسے ایک سفاک، بے رحم، ظالم اور سفاک شخص کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنے پر رضامندی ظاہر کر دے۔ یہ ناممکن ہے۔ بابو غلام حسین کی یہ بات سن کر سب حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ بابو غلام حسین اور اس کے ایک دوست نے یہ واقعہ سرکنڈوں کے پیچھے چھپ کر خود دیکھا تھا۔

بعد ازاں وہی پریت کور یار محمد کے ہمراہ سید ولایت حسین کے پاس پہنچی۔ اس نے پریت کور کی درد ناک کہانی سنی۔ اسے اپنے گھر میں رکھ لیا اور بیٹیوں جیسی عزت دی۔ کچھ عرصے کے بعد پریت کور اور یار محمد رشتہ ازواج میں اپنی مرضی سے منسلک ہو گئے۔ بابو غلام حسین گھر سے فرار ہو کر دریا کنارے کٹیا میں رہنے لگے۔ یہاں وہ اپنے رب کی تعریف و توصیف اور حمد و ثنا کرتے۔ بابو غلام حسین کی دعائیں قبول ہوتیں۔ ان کی شہرت سائیں سُچا کے نام سے ہو گئی۔ ایک وقت میں یار محمد اور ماضی کی پریت کور اور حال کی زیب النساء ان سے

گود ہری ہونے کی دعا کروانے گئی۔ ان کی دعا سے اللہ نے یار محمد کو ایک بیٹی اور پانچ بیٹے عنایت کئے۔ اس طرح ایک خانہ بدوش عورت بیمار رہتی۔ اس کی بیٹی بہت بدصورت تھی۔ کوئی اس سے بیاہ رچانے کو تیار نہ تھا۔ وہ سچا سائیں سے دعا کروانے کے لئے اسے لے گئی۔ سچا سائیں سے اسے دیکھ کر کہا یہ بہت حسین ہے اور اسے نکاح میں لے لیا۔ سُچا سائیں دنیا ومافیہا سے بے خبر اپنے رب کی محبت میں ڈوب جاتا ہے۔ بارہا اکرم اور جلال خان ملنے کے لیے گئے۔ ایک ایسے وقت میں جب اکرم ذوالقرنین ہر کہیں سے مایوس ہو چکا تھا کہ پاکھڑا پہلوان اس کی بیٹیاں اور مارگریٹ ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ سچا سائیں نے اسے خوشخبری سنائی کہ وہ پریشان نہ ہو۔ مبگی اسے ملنے آئے گی۔ چند دنوں بعد مارگریٹ اس سے ملنے آگئی۔

بوستان بگا کو لے کر راولپنڈی آگیا۔ اس نے اور اس کے بیٹوں نے درگاہ پیر بگا بنائی اور چلانا شروع کر دی۔ جب ان کی قائم کردہ چل پڑی تو انہوں نے بگے کو قتل کر دیا۔ اس کا جنازہ دھوم دھام سے ہوا۔ بگا سرکار کا دیدار عام ہوا۔ بگا سرکار کو دفن کر دیا گیا اب بوستان اور اس کے بیٹوں کی کمائی کا ذریعہ مستقل بنیادوں پر قائم ہو گیا۔ بگے کے والدین کو کسی قسم کی خبر نہ دی گئی کہ دنیا میں نہیں رہا۔ اس عرصے میں بوستان نے شہر اور ملک کے طاقتور خاندانوں اور بیوروکریٹ کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے۔ جب بگا سرکار کے والدین اور چچا اس سے ملنے کے لیے آئے تب انہوں نے بتادیا کہ بگا دنیا میں نہیں رہا۔ انہوں نے شور مچا اور بیٹے کو دیکھنے کی آرزو کا اظہار کیا تو حیلے بہانوں اور دولت کے ذریعے ان کا منھ بند کر دیا۔ بوستان جو کہا کرتا تھا کہ وہ راول ہے راولپنڈی راولوں کا ہے۔ اس کا حق اس شہر پر زیادہ ہے۔ اس نے لنگری پہاڑ پر درگاہ حضرت پیر بگا سرکار بنا کر ہمیشہ کے لئے خود کو طاقت ور شہرت یافتہ اور دولت مند بنا دیا۔

اکرم ذوالقرنین زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ تھا۔ مارگریٹ بچوں کے ہمراہ کینیڈا سدھار گئی۔ جلال قتل ہوا اور کلثوم ماری گئی۔ مل کے یونٹ اونے پونے فروخت ہو گئے۔ خان اسلم کو ویلڈر میں پڑے بیٹے سے زرہ محبت نہ رہی۔ اکرم کا کوئی دوست نہ رہا، ہمراہی باوفا دوست مارگریٹ بچوں کے ساتھ کینڈا مقیم ہو گئی۔ وہ یہاں اکیلا پڑا شراب پیتا رہتا۔ پھر ایک مقام آیا کہ اس نے شراب پینا ترک کر دی اور خود فراموشی کے عالم میں چلا گیا۔ آخر ایک شام اس نے تمام مزدوروں اور ملازمین کو ویلڈرنیس سے چھٹی دے دی۔ اس سے پہلے وہ اپنے لیے ویلڈرنیس میں ایک قبر کھود چکا تھا۔ اس میں ایک تابوت رکھا اور تابوت کا ڈھکن نیز مٹی اس طرح سے ترتیب دی کہ وہ جب تابوت کے اندر لیٹ جائے گا تو ایک ہی جھٹکے سے تابوت کو بند کر دے گا۔ وہ ایسی تکلیف ہو گی کہ تابوت بند ہوتے ہی منوں مٹی اس کے اوپر جا پڑے گی۔ وہ اپنے نظریات اور چاہتوں سمیت

راہی ملکِ عدم ہو جائے گا۔ یہ اس کا جنم تھا۔ اس نے کافی بنائی اور پی لی۔ رات ۱۲ بجے کا وقت تھا۔ اس نے کیک کاٹا اور جنم دن منایا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اتنا بے حس ہو چکا تھا اس نے سوچا کہ جلال ہو گا۔ اپنی بیوی سے چھپ کر کال کر رہا ہو گا یا پھر کلثوم ہو گی جو اپنے شوہر سے چھپ کر اس سے ملنے کی آرزو مند ہو گی۔ جبکہ یہ دونوں کردار پہلے ہی راہی ملکِ عدم ہو چکے تھے۔ بہر حال اس نے ریسیور اٹھایا اور پھر دوسری طرف سے آواز سنی۔ اس کی بیٹی سارا بول رہی تھی۔ ہیپی برتھ ڈے بابا جان۔ یہاں پر کہانی کا اختتام ہو گیا۔ ذیل میں "کُہر" میں محمد الیاس کے سماجی شعور اور عصری مسائل کا جائزہ لیتے ہیں۔

الف۔ مذہبی افکار کی عمل داری اور سماج پر اثرات

تاریخِ انسانی کے تہذیبی ارتقاء میں مذہب ایک غالب عنصر کے طور پر ملتا ہے۔ جہاں مذہب کو انسانی فلاح و بہبود اور اس کے ارتقاء کا ذریعہ بنایا ہے وہیں ہر خطے اور پر زمانے کے انسانوں نے مذہب کو بطور ہتھکنڈا بھی استعمال کیا ہے۔ ہر عہد میں دو طرح کے انسان رہے ہیں۔ ایک جنھوں نے مذہب کو بطور طرز حیات بنایا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مذہب کو آئین کا درجہ دیا، قانون کا درجہ دیا، مذہب کو بطور بود و باش اپنایا، مذہب ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ انہوں نے نیکی، بدی، اچھائی اور برائی کے جو معیار مقرر کیے تھے۔ ان پر کاملاً عمل درآمد کیا۔ ان سے سرِ مُو انحراف کرنا گویا ان کے لیے گناہِ کبیرہ تھا۔ یہ اپنے عہد کے پاکیزہ اور نیک لوگ تھے۔ جو نیکی کی راہ پر گامزن ہونے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ان کے خیال میں نیکی اور بھلائی نجات کا ذریعہ ہے اور انہوں نے نجات کے اس راستے پر گامزن ہونے کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیں۔

تاہم دورِ حاضر کی مانند جب تہذیبِ انسانی کی مختلف اکائیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ انسانی معاشروں کی بود و باش کو سمجھنے کی اپنی سی کاوش کی جاتی ہے تو یہ بات ہر عہد کے انسانوں میں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے کہ جہاں انسانوں کے بیچ مثبت فکر رکھنے والا اور مذہب کو عین شریعت قرار دینے والا طبقہ ہے۔ وہیں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ جنھوں نے مذہب کو دولت کمانے، ہوس پرستی یا پھر شہرت اور قوت کے حصول کا ذریعہ مان لیا حقیقت یہ ہے یہی وہ وہ لوگ تھے جو مجسم بُرائی تھے۔ جن کے وجود میں شیطان اور شیطانی فکر رچ بس گئی تھی۔ جن کے ہاں خدا کا وجود گویا ان کی کمائی اور سفلہ آرزوؤں کی تکمیل کا سبب تھا۔ انہوں نے مذہب کا مذاق اڑایا۔

ایسے طبقے کے ہاتھوں میں مذاہب کی مقدس عبادت گاہیں ہوس پرستی اور سرمایہ پرستی کی آماجگاہیں بن گئیں ایسے ماحول میں عورت کا حد سے سوا استحصال رواج بن گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مذہب ان کے لیے مذہب نہیں، ایک کاروبار بن گیا تھا۔ یہ کاروبار ہر صورت سُود مند ہونا چاہیے تھا۔ یہی انسان دشمنی ان کی فکر اور عمل کا مرکز تھی اور اسی کی تکمیل میں یہ لوگ شبانہ رُوز جُتے ہوئے تھے۔

اگر برصغیر کے تناظر میں دیکھیں تو یہاں دو بڑے مذہب موجود رہے ہیں ہندومت اور اسلام۔ دونوں مذاہب کے ایک ساتھ رہنے سے مسلمانوں نے بہت کچھ ہندومت سے ثقافتی یا تہذیبی ہم آہنگی کی وجہ سے اپنا لیا۔ جو بعد میں مذہبی اقدار کے طور پر رائج ہوتا گیا۔ پاکستان اسلامی ریاست کے طور پر وجود میں آیا۔ اسلامی ریاست کا تصور ہی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہاں مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ چونکہ یہ ریاست اپنی بنیاد میں عوام کے مطالبے کے طور پر وجود میں آئی۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں اکثریت مذہبی لگاؤ رکھتی ہے۔ اس مذہبی لگاؤ کی وجہ سے تمام امور میں مذہب بنیادی حیثیت اختیار کر گیا۔ محمد الیاس نے ناول میں کرداروں کے ذریعے یہ بات اجاگر کی ہے کہ مذہب کی یہ عمل داری جہاں معاشرے کو اعلیٰ اقدار سے جوڑ کر متوازن بنا سکتی ہے، وہیں اس کے برعکس اس کی اس حد تک گہری عمل داری کو سماج کے شر پسند اور مفاد پرست عناصر اپنے ذاتی فائدے کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

محمد الیاس کے ناول میں مذہب کی پیشکش کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں مذہب کی عملی صورتحال بہت مایوس کن ہے۔ مسلم معاشروں میں بھی اسلام سے قبل مذاہب کی مانند انسانوں کی توہم پرستی سے فائدہ اٹھانے والے بدعقیدہ لوگوں کی کثیر تعداد پیدا ہو گئی۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس طرح کی منفی فکر کے حامل افراد مسجد کو بطور کاروبار استعمال نہ کر پائے۔ قرآن میں تبدیلی ان کے لئے ممکن نہ تھی۔ رسولؐ کی ذات پاک کو متنازعہ بنانا ان کے لئے موت کا پیغام تھا لیکن شیطان نے انہیں نئی راہ دیکھا دی۔ اس طبقے کے لوگوں نے بزرگانِ دین کا رُوپ دھار کر معاشرے کے کم فہم اور توہم پرست انسانوں کا خوب استحصال کیا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ صحابہ کرام کے بعد اللہ کے محبوب اولیائے کرام نے

شریعتِ اسلامیہ کی حقیقی روح کو انسانوں تک پہنچانے اور انسانوں کی رہنمائی کے لئے اپنا کردار ادا کیا۔ ایسے مثبت فکر لوگ ہر عہد میں نورِ اسلام کو انسانوں تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں، لیکن افسوس ایسے لوگوں کے ساتھ ساتھ خُبثِ باطن سے بھرے ہوئے ایسے افرادِ معاشرہ بھی پنپتے رہے ہیں۔ جنہوں نے خود کو اولیاء اللہ کے روپ میں معاشرے کے سامنے پیش کیا۔ لیکن ایسے عمر بھر اولیا کی گرد کو بھی نہ پہنچ پائے۔ مذہب کے اس رُخ کی روایت اردو ادب میں نئی نہیں ہے۔ ادب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ادیب جو کچھ دیکھتا ہے اور جیسا محسوس کرتا ہے۔ وہی کچھ قرطاسِ ابیض پر بکھیر دیتا ہے۔ یہ فریضہ تنہا کسی ایک زبان سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے انجام نہیں دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہر زمانے اور ہر خطے کا ادب اس امر کی جزوی یا کلی ترجمانی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی ادب کے اندر چرچ اور اس سے متعلقہ دیگر رجحانات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہی معاملہ اردو زبان و ادب کے ساتھ بھی ہے۔ اردو طبقہ بخوبی آگاہ ہے کہ داستانوی ادب ہو، ناول ہو، ڈرامہ ہو یا شاعری، ہر صنف ادب میں معاشرتی کو رجحانات کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے اندر پائے جانے والے تضادات کو بیان کرنے میں کبھی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ گذشتہ چار پانچ سو سالہ ادبی تاریخ گواہ ہے کہ ادیبوں اور شاعروں نے ان متضاد رویوں کو بیان کرنے میں کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ سماج ہر عہد میں مختلف تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے۔ سماج کی صورتحال خواہ وہ مذہبی، سیاسی، معاشی ہو یا معاشرتی بدلتی رہتی ہے۔ سماج ان تبدیلیوں کے پیشِ نظر اپنی بقا اور مفاد کے لیے معاشرے میں دو طرح کی قوتیں برسرِ پیکار رہتی ہیں۔

مذہبی عملداری کے پیشِ نظر دیکھا جائے تو محمد الیاس کا نظریہ بھی یہی خیر و شر کا نظریہ ہے کہ ایک طرف تو دیندار لوگ جو اس معاشرے کے سچے خیر خواہ ہیں مذہب کی حقانیت اور رحمت سے انسان دوستی اور سماجی اعلیٰ اقدار کو معاشرے میں رواج دے کر اسے جنت نظیر بنانا چاہتے ہیں تاکہ یہ معاشرہ بغیر کسی تفریق کے سب کے لیے امن کا گہوارہ ہو۔ شر کی صورت میں محمد الیاس اس طبقے کی نقاب کشائی کرتے ہیں کہ جو لوگ

مذہب سے والہانہ وابستگی کو دیکھتے ہوئے عوام کے جذبات اور احساسات کو کسی خاص سمت میں ہوا دے کر اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ محمد الیاس کے نزدیک اس کی بنیادی وجہ مذہبی کم علمی اور توہم پرستی ہے۔ مذہب کو انسانی زندگی سے اور فطری افعال سے وابستہ رکھنے کے بجائے مذہب کے نام پر ایسی چیزوں کو فکر کا حصہ بنایا جاتا ہے جن میں کوئی حقانیت نہیں ہوتی۔ جیسے زرینہ بچوں کی شرارت کو معجزہ مان لیتی ہے۔ محمد الیاس اس کی فکری نہج اور توہم پرستی کو بڑی عمدگی سے ادا کرتے ہیں۔

"ذوالقرنین اور مارگریٹ کو نہ جانے کیا سوجھی کہ نہانے والے صابن کی دو ٹکیوں کے بہت باریک باریک ٹکڑے کیے۔ ایلومینیم کے لوٹے میں اسے خوب گھول کر لئی سی بنائی اور نلکے کی ٹونٹی پر ہاتھ کی کیف بنائی اور سارا محلول انڈیل دیا۔ دونوں بچے اس کام سے فارغ ہو کر حویلی کی چھت پر چلے گئے اور چاندنی کا نظارہ کرنے لگے۔ زرینہ بیگم وظائف اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر اٹھی اور باہر آ کر ہلکے سے نلکے کی ہتھی چلائی تو پہلے ہی مرحلے پر سفید دودھیا محلول بہہ نکلا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے تک بڑے خشوع کے ساتھ ایک طویل وظیفہ اور عبادت کر کے نکلی تھی۔ کچھ ذہنی کیفیت ایسی تھی گویا اعجاز و تصرف کی منزل آن پہنچی ہو۔ فوراً یقین کر بیٹھی کہ نلکے کا پانی دودھ بن گیا ہے۔ بڑی بلند اور لرزیدہ آواز میں کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگی۔ خان اسلم دوڑ کر باہر آیا تو بیوی کو دیکھا کہ کلام پاک کے ورد کے ساتھ بڑے احترام اور دھیرج سے نلکے کی ہتھی چلا رہی ہے جب کہ ٹونٹی سے سفید محلول خارج ہو رہا ہے۔ خان اسلم بھی بلند آواز میں کلمہ پڑھنے لگا۔ ذوالقرنین اور مارگریٹ چھت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو دونوں بچے سہم گئے۔ پھر مارگریٹ کو نہ جانے کیا خیال آیا، سرگوشی میں ذوالقرنین سے کہا۔ "اوئے اکو! بتانا نہیں کہ ہم نے صابن گھول کر ڈالا ہے ورنہ سخت پٹائی ہو جائے گی۔ پھوپھو نے نہ بھی کچھ کہا تو میری اماں مجھے مار دے گی۔ ذوالقرنین نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ مارگریٹ گھر جانے کے لیے سیڑھیاں اتر کر نلکے کے قریب سے گزری تو اس

وقت تک محلول کی سفیدی کافی کم پڑ چکی تھی اور پھر صاف پانی بہنے لگا۔ زرینہ بیگم نے باور کر لیا کہ اچھی بھلی کرامت کی منزل نصیب ہو گئی تھی لیکن نجس لڑکی کی وجہ سے چھن گئی۔ اُس نے قدرت کی جانب سے اسے ایک واضح اشارہ جانا کہ فلاح چاہتی ہو تو اس غیر مسلم خاندان سے دور رہو۔"[1]

یہ دونوں طبقے محمد الیاس کے ناول میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے رب سے محبت کرتے ہیں صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں۔ اپنے خالق کی رضا کے لیے شبانہ رُوز کاوشیں کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ اس کے بر خلاف ناعاقبت اندیشی کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ محمد الیاس نے "کُہر" میں سید ولایت حسین کی جس اسلامی فکر کو بیان کرتے ہیں، وہی کچھ اس کے من میں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی سماج میں ہم مذہبیت کے فقدان اور تشدد کو دکھایا ہے۔ تقسیم کے زمانے میں جب خان بہادروں نے ایک سکھ خاندان کو قتل کیا اور اس خاندان کی خاتون پریت کور کی عزت خاک میں ملانا چاہی۔ پریت کور کے ساتھ اس کی بچی بھی تھی۔ اس کی بچی کو فضا میں اچھال دیا۔ جسے ایک خدا ترس یار محمد نے فضا میں ہی پکڑ لیا تھا۔

"پریت کور سینے سے اپنی ایک سال کی بچی کو چمٹائے پتن کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی وہ بیس اکیس سال کی دراز قد کھلتی ہوئی رنگت والی خاصی خوبصورت سکھنی تھی۔ احمد دین اور محمد دین دونوں بھائی اس کے پیچھے دوڑے تو یار محمد نے بھی پیچھے کیا۔ ۔ ۔ دونوں بھائیوں میں لڑائی شروع ہو گئی دونوں اسے اپنی بیوی بنانا چاہتے تھے۔ محمد دین نے بچی چھین لی اور ٹانگوں سے پکڑ کر ہوا میں لہرائی۔ بیشتر اس کہ اس کا جسم درخت کے تنے سے ٹکرا کر بوٹی بوٹی ہو جاتا، یار محمد ایک ہی جست میں بچی اور تنے کے درمیان آ گیا اور معصوم جان کو ہاتھ میں لے لیا ساتھ ہی ایک درد بھری آہ کی صورت میں جملہ اُگل دیا۔ بوٹی بوٹی ہو جاتا، یار محمد ایک ہی جست میں بچی اور تنے کے درمیان آ گیا اور معصوم "اوئے! نہ مار ظالماں"[2]

پریت کور شاہ صاحب کے دربار پر حاضر ہوئی۔ جسے شاہ صاحب نے اپنے گھر میں بیٹیوں کی مانند رکھا اس کی عزت و حرمت، کھانے پینے اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا ہر طرح سے انتظام کیا۔ ان کے حسنِ سلوک

سے متاثر ہو کر اس نے اسلام قبول کیا اور بعد میں یار محمد کے ساتھ سید ولایت حسین شاہ نے اس کا نکاح کروا دیا نہ صرف پریت کور کو اپنے ہاں رکھا بلکہ ایک خرکار کے بیٹے کو پڑھایا لکھایا بھی۔ یہاں محمد الیاس مذہب کی وہ مثبت سمت اجاگر کرتے ہیں کہ جو مذہب کا اصل خاصہ ہے۔ یہاں مذہب کوئی خارجی بیانیہ نہیں بلکہ انسانیت اور زندگی کی ضرورت نظر آتا ہے۔ سماج کا بنیادی موضوع انسان ہے۔ متوازن سماج تب ہی ممکن ہے کہ جب تمام انسانوں کو ایک ہی طرح سے حقِ حیات حاصل ہو۔ ناول نگار عصری تناظر میں تعصبات کے پیشِ نظر ختم ہوتی، انسانیت کے لئے مذہب کی مثبت عمل داری کو باعثِ نجات دکھاتے ہیں۔ سید ولایت حسین شاہ کا کردار اصل میں مذہب کی وہ عملی صورت ہے جس کی اس وقت شدت پسندی میں جلتے سماج کو شدید ضرورت ہے۔ سید ولایت حسین کی مثبت اور روشن فکر سوچ کا اندازہ حضرت گل کے ساتھ ان کے دلچسپ مکالمے کی صورت میں ہوتا ہے۔

> "شاہ صاحب یہ تمہارا کمال ہے کہ خرکار کے بچے کو اتنا پڑھایا لیکن زیادہ پڑھائی سے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ ہم تو کہتا ہے کہ جب قرآن پاک پڑھ لیا تو سب ختم۔۔۔ بس اس سے اوپر کوئی علم نہیں۔ اس سے چھوٹا علم پڑھے گا تو بے ادبی کی بات ہے۔ قرآن پاک پڑھ کر چھوٹی موٹی کتاب پڑھے گا تو یہ ایسا ہے کہ جس طرح شتر سوار پیر جو۔۔۔ اونٹ سے اتر کر گدھی پر سوار ہو بیٹھے۔ ہمارا پورا بیس اولاد ہے اللہ کا بڑا فضل ہے۔ یہ دونوں بہن بھائی ہم کو اچھا لگتا۔ ان کی ماں کو بڑی دور سے لایا۔ بڑا مشکل پڑا۔ زبردست جہاد لڑا۔ اس کو مسلمان بنایا۔ اللہ! اجر ضرور دے گا۔ ہم کو اس کی ماں کا بہت خیال تھا اس کو دم کیا تو جان اچھی طرح نکل گیا۔ ہم نے اس کو مسلمان بنایا لیکن اس نیک بخت نے شکر نہیں نکالا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ معصوم تھا اللہ اس کو معاف کر دے گا۔"[۳]

محمد الیاس مذہب کی اس عملداری کو متضاد صورتوں میں دکھاتے ہیں۔ سید ولایت حسین شاہ کے کردار سے ایک پہلو یہ بھی نکل سکتا ہے کہ وہ صاحبِ ثروت اور معاشرے میں ایک اچھی شہرت والا شخص ہے۔ اس کے لئے یہ عمل مذہبی فکر کے علاوہ بھی کئی وجوہات کا حامل ہو سکتا تھا۔ دوسری بات کہ اس کے اس

عمل سے مذہبی رہنماؤں اور صاحبِ اختیار لوگوں کی مذہبی ذمہ داری تو سمجھ آتی ہے، لیکن عام فرد کی صورت میں مذہب کی مثبت عملداری کا پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔ محمد الیاس اپنے سماجی شعور کی بدولت سماج کے کسی بھی فرد سے صرفِ نظر نہیں کرتے۔ انہوں نے عام آدمی کے طور پر بابو غلام حسین کا کردار تخلیق کیا ہے۔ یہ کردار ایک معمولی اور عام آدمی ہے۔ جسے مذہب سے وابستگی معاشرے کا ایک مثبت اور زندہ کردار بنا دیتا ہے۔

سید ولایت حسین شاہ کے کردار کو فاضل ناول نگار نے ایک ایسے کردار کی صورت میں تخلیق کیا ہے۔ جو شریعت اسلامیہ کی اعلیٰ روایت کا نادر نمونہ ہے۔ اسلامی شریعت انسانوں کے درمیان ظلم کی بنیاد پر تقسیم کو روا نہیں رکھتی۔ بلکہ حکم تو یہاں تک ہے کہ کسی ملک پر فتح حاصل کریں تو وہاں کے عوام کو اپنی مذہبی اقدار کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دیں۔ سید ولایت حسین شاہ کا کردار اسی روایت کا حامل نمونہ نظر آتا ہے

محمد الیاس نے بابو غلام حسین کو مثبت قدروں کی علامت دکھایا ہے۔ یہ عوام میں سچا سائیں کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ سُچا سائیں کے اندر صوفیانہ اقدار کا عکس نمایاں ہے۔ بابو غلام حسین ابتدا میں ایک ڈاک خانے میں بطور ٹائپسٹ کام کرتا تھا۔ یہ لوگوں کو تار بھیجا کرتا تھا۔ ایک دن نوکری سے استعفیٰ دے دیا پتا چلا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کرنا شروع ہو گیا ہے۔ آسمان کی طرف نظر اٹھاتا ہے اور ایسے لگتا ہے کہ وہ آسمان والے سے محو گفتگو ہے۔

"اب تار کے بغیر بھی رابطہ ہو جاتا ہے اس لیے وہ اس کا محتاج نہیں رہا۔"[۴]

بابو غلام حسین کو شہر کی ایک لڑکی نے اسے آنکھ بھر کے دیکھا اس کی عاشق ہو گئی۔ یہ ایسا کردار تھا۔ جس کی ذات سے نور کی کرنیں نکلتیں اور دیکھنے والے کو اپنے ہالے میں لے لیتی۔ یہ لڑکی ایک بڑے جاگیر دار سیاستدان کی بیٹی تھی۔ بہت سے لوگ یہ چاہتے تھے کہ ان کا تعلق اس خاندان سے جوڑ جائے لیکن وہ لڑکی ثمینہ بابو غلام حسین کے عشق میں بری طرح سے گرفتار ہو گئی۔ لیکن بابو غلام اپنی ہی طرز کا ایک کردار تھا۔ اس نے ثمینہ کی جانب دیکھا تک نہیں۔ اس کے والدین نے خود رشتے کی بات چلائی۔ لیکن بابو غلام حسین نہ مانا ثمینہ خود بابو غلام حسین کی ماں کے پاس آئی اور اس کی ماں سے درخواست کی کہ وہ اسے بابو غلام حسین کے لئے مانگ لے اور اس کی آمد کو راز میں رکھے۔ جب بابو غلام حسین اور دیگر افراد نے اس سے درخواست کی کہ وہ خان بہادر کی لڑکی سے شادی کے لیے ہاں کہہ دے تب اس نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا:

"میں ایسی لڑکی کے ساتھ زندگی بتانے کا عہد کیسے کرلوں جس کے باپ کی شقی القلبی
اور بے اصولی کا چشم دید گواہ ہوں"[۵]

ثمینہ کا والد ڈاکخانے کے اپنے دوست اور بابو غلام حسین کے ہم کار سے درخواست کرتا ہے کہ وہ بابو غلام حسین پر دباؤ ڈالیں تاکہ وہ خان بہادر کی لڑکی سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے۔ تب بابو غلام حسین یہ بات کر کے سب کو ورطہء حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ لڑکی کے باپ کا ہونٹ ایک جگہ سے کٹا ہوا ہے۔ باپ کو سخت غصہ آتا ہے کہ بابو غلام حسین نے شادی لڑکی سے کرنی ہے یا اس کے باپ سے۔ بالآخر بابو غلام حسین نے بتادیا کہ خان بہادر کا ہونٹ کیوں کٹ۔ اس نے بتادیا کہ کس طرح بچپن میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ سرکنڈوں کے پیچھے چھپ کر اس کے دوست نے دیکھا کہ خان بہادر اور اس کے بھائی نے ناحق مہنگا سنگھ کا قتل کیا۔ اس لیے کہ وہ مولا حسینؑ کا عقیدت مند تھا۔

"یہ وہی مہنگا سنگھ تھا جو ہمیشہ نویں اور دسویں محرم کی مجالس سنا کرتا تھا اور کہا کرتا کہ قسم
گُرُو کی حسینؑ جیسا دنیا میں کوئی نہ ہو گا۔ تقسیم سے پہلے آخری دسویں محرم کا ماتمی جلوس
دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکا تو حلقے کے عین بیچ میں کھڑا ہو کر ایسے والہانہ ماتم کیا کہ پورے
شر کا کا جوش آسمان کو چھونے لگا اور کئی ماتمی مہنگا سنگھ سمیت بے سدھ ہو کر گر پڑے۔
ایسے دل گداز شخص کو ان ظالموں نے دنیاوی مال کے لیے مار ڈالا۔"[۶]

پھر اس کی مظلوم بیوی کی عزت سے کھلواڑ کرنے کی کوشش کی۔ اسی کی پاداش میں خان بہادر کا ایک ہونٹ شدید زخمی ہو گیا۔ اس کے خاموش ہونے پر سید صاحب نے فرمایا:

"چشمِ بد دور اللہ تعالیٰ تمھیں اپنی پناہ میں رکھے۔ کپتان صاحب! اسے تنگ نہ کریں
دو گھوڑا بوسکی میں ملبوس دراصل یہ گڈری پوش درویش ہے۔۔۔ سید کی بات یاد رکھنا۔
آج نہیں تو کل ثابت ہو جائے گی۔"[۷]

بابو غلام حسین کا یہ واقعہ کئی جہتیں رکھتا ہے۔ جن سے سماج کی مختلف اعلیٰ اقدار اجاگر ہوتی ہیں۔ جن میں سب سے نمایاں مذہبی رواداری اور انسانیت ہے۔ مقتول مہنگا سنگھ غیر مسلم ہے۔ غلام حسین کی اس سے محبت اور اس کے قاتل سے نفرت یہ وہ رواداری ہے۔ جس کا اسلام متقاضی ہے۔ قتل ہونے والا امام حسینؑ سے محبت رکھتا ہے یعنی وہ خود بھی معاشرے میں مظلومیت کا حمایتی اور ظالم کا مخالف ہے۔ اس کے برعکس لڑکی کے والد میں وہ شدت پسندی نظر نہیں آتی کہ جس میں دوسرے مذاہب سے زیادہ اسلام ہی میں مسلکی

تعصب کی بُو آتی ہے۔اس کے قتل کی وجہ غیر مسلم ہونے سے زیادہ امام حسینؑ سے وابستگی ہے۔اس کردار کی موجودگی میں بابو غلام حسین کا کردار اور نکھر کر سامنے آتا ہے۔وہ بین المذاہب اور بین المسالک دونوں طرح سے رواداری اور محبت اجاگر کرتا ہے۔موجودہ عہد میں انہی بنیادوں پر جاری قتل وغارت ہر فرد سے بابو غلام حسین ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔اس نہج پر یہ کردار سماج اور اس کی اس عہد میں سب سے اہم ضرورت سے جڑ جاتا ہے۔جتنی شدت پسندی سے ہمارے ہاں تعصب پرستی ہے مصنف اتنی ہی وسیع رواداری کا تقاضا کرتا نظر آتا ہے۔اسی وسیع النظری کو وہ ارتقائی عمل قرار دیتے ہوئے تصوف وطریقت سے متصل کر دیتا ہے۔یہ اس اتصال اپنے پس منظر میں برصغیر کے اس وسیع صوفیانہ روایت کو لئے ہوئے ہے کہ جس کے نتیجے میں اسلام پھیلا۔گویا مصنف اس رواداری اور عالمگیر محبت کو اسلامی تصوف وطریقت کا مرکزہ ظاہر کرتا ہے ۔بابو غلام حسین کا سُچاسائیں تک کا سفر طریقت اور شریعت کے زیرِ سایہ چلتا رہا۔یہی سائیں سُچاجب دریا کنارے کٹیا نشین ہو گیا۔اس کی تاریں اپنے خالق سے مل گئیں۔جب رابطہ اصل حقیقت مطلق کے ساتھ ہو گیا تو اس کے لیے دنیا مردار کی مثل ہو گئی۔اسی طرح قرآن مجید میں دنیا کو محض دکھاوا اور دھوکہ قرار دیا دیا گیا ہے۔سائیں سُچا بھی دنیا کی حقیقت کو پا گیا تھا۔وہ دنیا کو تیاگ کر ایک صوفی کی مانند اہلِ تصوف کی مثل نہ صرف دریا کنارے کٹیا میں زندگی گزارنے لگا بلکہ معاشرے کے راندہ درگاہ ہو گئے۔بہت سے کردار اس کے گرد جمع ہو گئے اور وہ ان سے پیار اور محبت کا سلوک کرنے لگا۔محمد الیاس نے سائیں سُچا کی شکل میں ایسا کردار تخلیق کیا ہے جو تصوف اسلامی اور طریقت اسلامی کا آئینہ دار دکھائی دیتا ہے۔سید ولایت حسین شاہ اور بابو غلام حسین وہ نمائندہ کردار ہیں جو سماج کے لیے بطور نمونہ ہیں۔لوگ ان سے ہدایت لیتے ہیں لیکن یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ ایسے کردار کم تعداد میں موجود ہو سکتے ہیں۔معاشرے کے بہت سارے افراد اس شدت اور کمال تک نہیں پہنچتے۔

محمد الیاس اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے۔لہذا وہ نمایاں کرداروں کے علاوہ کئی ایسے کردار تخلیق کرتا ہے جو معاشرے میں غیر محسوس طریقے سے اسی روش کو اپنائے ہوئے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق معاشرے کی مثبت تعمیر میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔انہی کرداروں کی وجہ سے معاشرہ تباہی وبربادی سے محفوظ ہے۔ان

کرداروں میں حافظ صاحب، مارگریٹ اور ذوالقرنین کا کردار اہم ہے۔ حافظ صاحب کا کردار تعصب اور شدت پسندی کے عہد میں ایک اعلیٰ مذہبی قدر کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ سماج میں کوئی بڑی شخصیت یا بڑا عہدہ دار نہیں ہے بلکہ ایک عام دکاندار ہے، لیکن وہ اس شدت پسندی کے خلاف ایک مکمل اور عملی جدوجہد کی صورت میں سامنے آتا ہے جو اس کے مزاج میں رچی بسی ہے۔ وہ انسانیت کے ناطے ایک غیر مسلم خاندان کو کسمپرسی اور غربت کی حالت میں شامان خوردونوش دے کر معاشرے کو یہ ترغیب دیتا ہے کہ معاشرے کی تعمیر کسی بھی سطح پر رہ کر اپنی بساط کے مطابق کی جاسکتی ہے۔ اس مثبت عمل کے لیے وہ سماج کی دشمنی بھی مول لے لیتا ہے لیکن اعلیٰ اقدار کا دامن نہیں چھوڑتا۔ محمد الیاس اس کردار کے ذریعے موجودہ عہد میں ہر فرد کو اس کی ذمہ داری سمجھاتے ہیں۔ مارگریٹ جب حافظ کی دکان پر سودا لینے جاتی ہے تب اس کی جو گفتگو حافظ کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ اپنے اندر کمال انسانیت سموئے ہوئے ہے۔ اس سے ایک تو مذہبی رواداری نظر آتی ہے اور دوسری طرف احساس کا جزبہ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

"تایاجی ! ابانے کہا ہے کہ پیسے نہیں ہیں کچھ سودا ادھار دے دیں۔"۔۔۔حافظ صاحب نے جلدی جلدی فہرست بنائی۔

آٹا ایک من، چاول باسمتی دوسیر، چاول ٹوٹا پانچ سیر، چینی دوسیر، دال چنا، ماش، مونگ، مسور، ثابت کالے چنے، سفید چنے پوتھی تمام ایک ایک سیر، سبز پتی کے دوڈبے، گھی کا بڑا ڈبا، موچسوں کا ایک ڈبا۔ چھوٹے بیٹے کو فہرست تھمائی کہ سودا نکال کر رکھے۔۔۔ ایک الفافے میں نگدی اور مخانے ڈال کر مارگریٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"آج! جھونگا نہیں لینا" وہ مسکرا کر بولی "وہ تو نقد پیسے ہوں تو لیتے ہیں ناں۔۔۔ حافظ صاحب نے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور کہنے لگے۔

پیسے ہوں یا نہ ہوں۔ بیٹیوں کو جُھونگا ضرور ملتا ہے اور زیادہ اس لیے کہ بہت دنوں کا اکٹھا ہوا پڑا ہے۔۔۔ پھر قدرے توقف کیا اور مزید جھک کر دھیمے لہجے میں بولے۔

"بیٹی! پہلوان سے کہنا کہ پیسوں کی فکر نہ کرے۔ سودا ختم ہو جائے تو ضرور آ کے لے جانا۔ میں کو د بھی اس سے ملنے آؤں گا۔ سنا ہے بہت بیمار رہنے لگا ہے۔" پھر انہوں نے دس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ یہ اپنے ابا کو دئ دینا۔"[۸]

اسی طرح ذوالقرنین کا کردار بھی ہمیں مثبت اقدار کی عملی صورت نظر آتا ہے۔ حافظ کے کردار کے برعکس ذوالقرنین کا کردار کی جہتوں پر محیط ہے۔ جس میں مصنف نے ایک کردار کے ذریعے فرد کی سماجی سیاسی اور مذہبی ذمہ داریوں کو عصر حاضر کے تناظر میں دکھایا ہے۔ اس کے والدین عیسائی خاندان سے فائدہ اٹھانے کے باوجود تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا استحصال کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس وہ انہیں بے لوث ہر ممکن مدد فراہم کرتا رہتا ہے۔ یہاں وہ مذہبی رواداری اور سماجی ذمہ داری کو بخوبی نبھاتے نظر آتا ہے۔ یہ رویہ اس کا صرف مذہبی تقسیم کے حوالے سے نہیں بلکہ طبقاتی تقسیم کے حوالے سے بھی ہے۔ اجر اور اجیر کا تعلق سماجی اخلاقیات کے بارے میں کیا ہونا چاہیے۔ مزدوروں کے ساتھ اس کا رویہ عملی صورت پیش کرتا ہے۔ اس کا ایک حوالہ سیاسی وابستگی بھی ہے۔ یہاں محمد الیاس کی بھرپور فنکارانہ صلاحیت نظر آتی ہے کہ انھوں نے ایک کردار میں سماج کی متنوع ضروریات کو عصرِ حاضر کے اعتبار سے ایک مکمل اور عملی صورت میں دکھایا ہے۔ یہاں ان کے سماجی شعور کی گہرائی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عہد میں فرد کے، سماج کے مسائل اور معاملات سے کس قدر آشنا ہیں اور ان مسائل کے حل کے متعلق سماجی رویوں کے ایک بہترین مبلغ بھی نظر آتے ہیں۔

مارگریٹ ایسا کردار ہے جو اپنی تمام تر مذہبی وابستگیوں کو قائم رکھتے ہوئے سماجی وابستگیوں کو قائم رکھتے ہوئے سماجی بردباری کی ایک عمدہ مثال ہے کہ وہ کسی دوسرے مذہب کے لوگوں سے اتنی شدید نفرت اور استحصال کا سامنا کرنے کے باوجود اس مذہب اور اس سے متعلق لوگوں سے نفرت نہیں کرتی، بلکہ وہ سماجی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھائی کی روش کو جاری رکھتی ہے۔ یہ کردار دیگر کرداروں کی نسبت زیادہ جاندار اس لیے بھی ہے کہ یہ اقلیت اور کمزور ہوتے ہوئے بھی نفرت یا شر انگیزی نہیں اپناتا، بلکہ اعلی اقدار کا دامن

تھامے رکھتا ہے۔ یہاں محمد الیاس کی سماجی سوجھ بوجھ کی وسعت سامنے آتی ہے کہ وہ اکثریت واقلیت دونوں کی سماجی ذمہ داریوں اور سماجی حقوق کے بہترین نباض کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہ ولایت حسین شاہ اور بابو غلام حسین کے نمایاں کردار ہو، مارگریٹ، ذوالقرنین یا حافظ جیسے معاشرے کے عام کردار عملی طور پر اور اس کے ساتھ ساتھ فطری طور پر لوگوں کی مذہبی وابستگی کو معاشرے کی تعمیر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ سید ولایت حسین شاہ کی غریبوں کی خدمت، ان کی مالی معاونت، ان کے مسائل کا حل، بلا تفریق لوگوں سے محبت یہ سارے اعمال صرف ولایت حسین شاہ کے اعمال نہیں رہتے بلکہ ایک مذہبی شخصیت کے اعمال بن جاتے ہیں۔ لوگوں کی مذہب سے وابستگی انہیں سید ولایت حسین کی یہ فکر اور ان کے عمل اپنانے کی ترغیب دیتی ہے۔ یہ مذہب کی وہ مثبت عمل داری ہے جو محمد الیاس اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ اس فکر کا اثر عام طبقہ پر یوں ہوتا ہے کہ سید ولایت حسین شاہ کی صحبت میں بیٹھنے والا ایک شخص ان سے کم ذاتوں کو برابر تعلیم دینے کے بارے میں جب گفتگو کرتا ہے تو سید ولایت حسین شاہ کی شخصیت کا اثر اس میں خوب بولتا ہے۔ شاہ صاحب اور حضرت گل کا مکالمہ ملاحظہ ہو:

> "شاہ صاحب! یہ تمھارا کمال ہے کہ خرکار کے بچے کو اتنا پڑھایا کہ وہ اب حکومت سے وظیفہ لے گا۔ سچی بات ہے۔ ہم بہت حیران ہے۔ لیکن پڑھائی سے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ ہم تو کہتا ہے کہ جب قرآن پڑھ لیا تو سب ختم۔ بس اس سے اوپر کوئی علم نہیں ہے۔ پھر جب اتنا بڑا علم مل گیا تو خدا کا شکر نکالو۔ اس سے چھوٹا چھوٹا علم پڑھے گا تو بے ادبی کی بات ہے۔ ہم نے تمھارا حکم مانا۔۔۔ تم نے دونوں کو قرآن پڑھایا، اللہ اجر دے گا۔ ساتھ ساتھ اور کتابیں پڑھایا، ہم نے صبر کیا۔ سب اللہ پر چھوڑ دیا۔ قرآن پاک پڑھ کر چھوٹی موٹی کتاب پڑھے گا تو یہ ایسا ہے جس طرح شتر سوار پیر چُو۔۔۔۔ اونٹ سے اتر کر گدھی پر بیٹھے تو اس پاگل کے سر پر جوتے مارو۔"

شاہ صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "حضرت گل! یہ اونٹ سے اتر کر گدھی پر سوار ہونے والی بات نہیں، اللہ کا حکم ہے کہ علم سیکھو۔ صرف قرآن پاک کی شرط نہیں۔ حکم ہے

سب علوم سیکھنے کا۔ گویا جس قدر ممکن ہو۔ تمھارے پاس جیپ ہے، ٹریکٹر اور ٹرک ہیں ۔یہ سب کچھ علم سیکھنے سے بنتا ہے۔ اگر صرف قرآن پاک پڑھا ہو تو ٹرک وغیرہ نہیں بن سکتا۔ یہ سب ترقی علم کی وجہ سے ہوا ہے۔"[۹]

دوسری طرف لوگوں کی مذہب سے متعلق اسی وابستگی کو شر پسند عناصر اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لوگوں کی مذہب سے دوری اور مذہبی تصورات سے کم شناسی اور کہیں ایک دوسرے سے حسد اور لالچ انہی عناصر کا شکار بنا دیتا ہے۔ ایسے ہی دو کردار نصیر اور اس کی بیوی زرینہ ناول کا اہم حصہ ہیں۔ یہ کاملاً منفی کردار ہیں اور ایک ایسے معاشرے کے عکاس ہیں۔ جہاں خواتین کا تعلق اشرافیہ سے ہو یا بورژوا سے دونوں ہی باآسانی توہم پرستی کی وجہ سے تعویذ گنڈے کرنے والے نام نہاد پیروں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں جب انسان چاند پر قدم رکھ چکا ہے اور دنیا گلوبل ولیج بن چکی ہے۔ ہمارا معاشرہ باوجود کہ ایک مسلم معاشرہ ہونے کے توہم پرستی کے جال میں اس حد تک الجھ چکا ہے کہ اس سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔ ایسے ہی دو کردار ناول کا حصہ ہیں۔ ایک نصیر اسلام ہے مگر اس کی ذات شریعت اسلامی کے مکمل متضاد دکھائی دیتی ہے اسی طرح اس کی شریک حیات کا نام زرینہ ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی اس معاشرے کے بدترین کردار ہیں۔ جب کوئی عورت دولت کی خاطر اس بات کو قبول کر لے کہ اس کا شوہر اس کے سامنے بدکاری کرے اور اس کے دل کے کسی کونے کھدرے میں غیرت کی رمق نہ جاگے تو ایسی عورت، عورت ہونے پر سوالیہ نشان لگا دیتی ہے۔ اسی حوالے سے ناول میں حسینہ کا مکالمہ یوں بیان ہوا ہے۔

"کہیں دل نہ دے بیٹھیو۔ اپنے سر تاج کو بن ماس کی طرح چمٹے دیکھتی ہوں۔۔۔ قسم پرودگار کی دل پر چھریاں چلتی ہیں۔ ہم سی بھلا کم بخت ماری بھی کوئی ہو گی۔ خود سے اپنے میاں کو سرکاری سانڈ بنا رکھا ہے۔"[۱۰]

اسی طرح ایک ایسا شخص جو اس حد تک حیا باختہ ہو جائے کہ وہ اپنی شریکِ حیات اور نوجوان لڑکے کے سامنے کسی شریف بی بی کو اپنے جال میں پھنسا کر بدکاری کرے۔ یہ مذہبی معاشرے کی شکست و ریخت کا واضح اظہار ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی ایک نامعقول اور مخبوط الحواس لڑکے کو قید میں رکھے ہوئے ہیں۔ جسے خود اپنی ذات کا بھی نہیں پتا۔ اسے اپنے قول و فعل کا علم نہیں۔ صرف اس کی شخصیت پر ہول بن کے چھینٹے پڑ رہے ہیں۔ اس وجہ سے اسے پیر کے روپ میں ان دونوں میاں بیوی نے ڈھال دیا ہے۔ ان دونوں میاں بیوی

اور جوان لڑکے کے پسِ منظر میں دراصل اس معاشرے کا بہت بڑا المیہ بیان کیا گیا ہے۔ جس کی بنیاد توہم پرستی پر ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں پر بے اولاد اور بیٹیوں کی مائیں بیٹے کی تلاش میں کسی نام نہاد پیر فقیر کے ہتھے چڑھ جائیں اور عزت گنوا بیٹھتی ہیں۔ نیز مسلسل بلیک میل ہوتی چلی جائیں اور اولاد پیدا ہونے کی صورت میں اسے جائز اولاد تصور کریں۔ ایسے معاشرے کا مستقبل بہت بھیانک اور تاریک ہوتا ہے۔ محمد الیاس اس توہم پرستی اور ضعیف الاعتقاد معاشرے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> "وہی جہالت، توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی عام تھی، جس کے مظاہر، معاشرے میں ساٹھ برس سے دیکھتے آرہے ہیں۔ گویا ہمارے آدمی کا ذہنی ارتقا صدیوں سے رکا ہوا تھا اور ستم بالائے ستم قوم مجموعی طور پر خبطِ عظمت میں مبتلا تھی۔"[11]

خان اسلم کی بیوی کا کردار منافقت اور بداخلاقی کا مرقع ہے۔ یہ دن رات خان نمازیں پڑھتی ہے۔ تسبیحات پڑھتی ہے۔ ورد کرتی ہے۔ اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذکر بات بات میں کرتی ہے لیکن شریعت کو اپنے مفادات کے مطابق ڈھال لیتی ہے اور ایک نوجوان عیسائی لڑکی کے ساتھ ضد بازی کو صلیبی جنگ تصور کرنے لگتی ہے۔ اپنے تضاد، منافقت کم علمی اور جہالت کے ہاتھوں بیٹے کی زندگی برباد کر ڈالی ہے۔ جو معصوم فطرت اور معصوم دل لے کر پیدا ہوا تھا۔ یہی عورت توہم پرستی کا شکار ہونے پر بمشکل اپنی عزت وآبرو بچانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسے معاشرے کی کہانی ہے۔ جہاں توہم پرستی حد سے سوا ہو گئی ہے۔ سُنی سُنائی باتیں اور مختلف قسم کے جھوٹے سچے واقعات کو اسلام تصور کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل حیات لکھتے ہیں:

> "اسلامی معاشرے میں نام نہاد پیروں کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ، خاص طور پر حکومتوں میں شامل لوگوں کی ان کے ساتھ اندھی عقیدت اور اصل اور نقل میں فرق کرنے کی صلاحیت سے عاری پن کو بھی ناول نگار نے ناول کے بیانیے کا حصہ بنایا ہے۔ یہ ہمارا المیہ ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے پیارے نبیؐ کی تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور لکیر کے فقیر بن کر رہ گئے۔ نام نہاد پیروں کی خواتین کے ساتھ جنسی زیارتی اور ان کا جسمانی اور معاشی استحصال کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ بگا پیر، بوستان، نصیر الاسلام اور حسینہ جیسے ٹھگ، بشارتیں دینے والے عبادت گزار اور اپنی مرضی سے مذہب کی تشریح کرنے والے لوگ اس اسلامی معاشرے میں جابجا نظر آتے ہیں۔ جن کے

کر توتوں کی سزا" حافظ بر خودار جیسے اسلام کے سچے شیدائی بھگتتے ہیں۔ محمد الیاس نے اس المیے کی عکس بندی بھی فنکارانہ مشاقی سے کی ہے۔"[۱۲]

ناول میں بوستان نامی ایک نہایت چالاک اور مکار کردار بھی موجود ہے۔ بوستان جیسا ابن الوقت اور مردہ فروش کی کہانی ناول کا حصہ ہے۔ بوستان نے بگا کے گھر والوں کو روپے پیسے دولت کے خواب دیکھائے۔ چنانچہ انہوں نے بگا کو کرائے پر دے دیا۔ وہ اسے لے کر راولپنڈی آ گیا۔ اس کے دونوں بیٹے ان پڑھ اور جاہل تھے۔ انھیں لاری اڈے پر کوئی کام مل جاتا تو کرتے۔ بوستان نے دونوں کو بلایا اور کہا میں نے تمھارے مستقبل کا بندوبست کر دیا۔ لنگری پہاڑ پر بوستان اور اس کے بیٹوں نے درگاہ پیر بگا بنائی اور وہی کام کرنا شروع کر دیا جو نصیر اور زرینہ کرتے رہے تھے۔ بوستان بڑا کایا شخص تھا۔ اس نے بڑے خاص وضع اور طریقے سے لنگری پہاڑ پر دربار پیر بگا سرکار چلانا شروع کر دیا۔ محفل ہوتی اور پیر بگا کو ہر روز نہلایا جاتا۔ اسے زبردستی گدی پر بٹھادیا جاتا۔ بوستان کے بیٹے بھی صاف ستھرا لباس پہننے لگ گئے۔ چہرے سے پیر معلوم ہوتے تھے۔ اس دربار پر کسی بھی طرح سے بوستان نے عورتوں کی عصمت کے ساتھ کوئی کھلواڑ نہیں کیا۔ تاہم بوستان کا بیٹا گلزار امرد پرست تھا۔ اس نے ایک لونڈار کھا ہوا تھا۔ جس کے ساتھ وہ ہر رات بد فعلی کرتا۔ ایک روز بوستان اپنے فرزند کے گوشہ عافیت میں صبح ہی صبح وارد ہوا اور اسے ناغہ کرنے کو کہا۔ اس پر بیٹا کھسیانا ہو کر کہتا ہے۔

"اباجی! ناغہ ہی ناغہ ہے۔ معصوم بچہ بے چارہ اپنوں سے بچھڑا ہوا ہے۔ ذرا سہا، ذرا دم سے دلاسے کے لیے پاس بلالیتا ہوں۔"[۱۳]

بلاشبہ برصغیر کے معاشروں میں بالعموم اور پاکستانی معاشرے میں بالخصوص بزرگان دین موجود رہے ہیں۔ اللہ رب العزت نے دنیا کے ہر خطے میں مادی نظام کو چلانے کے ساتھ ساتھ روحانی نظام چلانے کا بندو بھی فرمایا ہے۔ یہ روحانی نظام وہ اولیاء کرام کے ذریعے چلاتا رہا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان معاشروں میں بڑی تعداد ایسی درگاہوں اور درباروں کی ہے۔ جہاں پر روزی روٹی کا سامان پیدا کرنے کے لیے محض ایک قبر بنائی گئی ہے۔ اس کے مجاور موجود ہیں۔ نام نہاد گدی نشین بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ چرب زبان، تیز دماغ اور طرار ہوتے ہیں۔ ان کی شبانہ رُوز یہی کوشش ہوتی ہے کہ اللہ کے سادہ اور معصوم لوگوں کو اپنے جال میں پھنسائیں اور خوب لوٹیں۔ بوستان اور اس کے بیٹے بعینہ ایسے کرداروں میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔ لنگری پہاڑ پر درگاہ پیر بگا سرکار کئی سبق اپنے اندر رکھے ہوئے ہے۔ اس درگاہ کے ذریعے مصنف بجا طور پر ہمارے معاشرے کی توہم کی عکاسی کرتا ہے۔

درگاہ بگا سرکار اس بات کی مکمل ترجمان ہے۔ کوئی شخص بگا سرکار کا دکھ نہیں سمجھتا۔ اس سے ہم کلام نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کا درد سمجھنے کے بجائے بوستان کی ترجمانی کو کافی قرار دیا جاتا ہے۔ پھر بگے کی اندوہ ناک موت اور اس کی قبر ایک اور المیہ کی جانب توجہ مرکوز کرواتی ہے۔ بوستان جیسا نام نہاد جدی نشین اشرفیہ کے ساتھ تعلقات استوار کر لیتا ہے۔ حکومتِ وقت تک رسائی پالیتا ہے۔ ارد گرد کی گدیوں سے تعلقات بنالیتا ہے۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کی عکاسی ہے۔ اس معاشرے میں جھوٹے سچے جس طرح طاقتور ہوتے ہیں۔ کوئی اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ دونوں قریشی بھائی اپنے بیٹے کے ساتھ بوستان کے پاس آتے ہیں۔ وہ انہیں بگے کی موت کے بارے میں بتادیتا ہے۔ وہ تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔ اس وقت حیرت کا ایک باب کھلتا ہے۔ جب قریشی کا بیٹا اپنی جیب میں اسلحہ رکھ کر بوستان کے سامنے بیٹھتا ہے۔ بوستان محض اندازوں کی بنا پر اس کی جیب میں رکھے ہوئے اسلحے کے بارے میں جھوٹی سچی چند باتیں کہتا ہے۔ یوں مشہور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی توہم پرستی ہے۔ اگر عقیدہ مضبوط ہو تو اس طرح کی باتیں اثر انداز نہیں ہوتیں۔ بیٹا صادق قریشی کا اور بھتیجا صدیق قریشی کا ہے۔ قاتل بوستان اور اس کے بیٹے ہیں۔ لیکن حیرت ناک بات یہ ہے کہ قاتل مقتول کا دربار بنا کر نسلوں تک کمائی کا ذریعہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ قاتل اتنے مضبوط ہو جاتے ہیں کہ مقتول کے وارث ان کی دھمکی میں آجاتے ہیں۔ ایسے میں کسی معاشرے کی تباہی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ محمد الیاس اسی معاشرتی تباہی کا ذکر کرتے ہیں۔ پاکستان کے طول و عرض میں ایسے نام نہاد بگے، بوستان اور گلزار چپے چپے پر ملیں گے۔ یہ نام نہاد بزرگ اور پیر گلزار کی طرح بدکاری میں بھی پورے اترتے ہیں۔ جب دولت کی ریل پیل ہو اور ایک ایسے ذریعہ سے دولت آرہی ہوں جو جائز نہ ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دولت استعمال کرنے والے کردار پاکیزہ اور پاوترہ جائیں گے۔ گلزار کا ایک لونڈے پر فریفتہ ہونا اس نام نہاد توہم پرست معاشرے کی کلی کھول رہا ہے۔ اگر ناول میں کوئی خالص کردار نظر آتا ہے تو وہ بگے کی ماں کا کردار ہے۔ جو بگے کی فروخت سے لے کر موت تک اسے خواب میں دیکھتی ہے۔ اپنے بیٹے کا درد محسوس کرتی ہے۔ روتی رہتی ہے اسے کمائی سے غرض ہے نہ دولت سے۔ اسے غرض ہے تو صرف اپنے بیٹے سے جسے بہیمانہ طور پر قتل کر دیا گیا۔

یوں ناول نگار نے سید ولایت حسین شاہ اور بابو غلام حسین عرف سُچا سائیں جیسے نیک ولیوں کے عکاس کرداروں کا ذکر کیا ہے تو دوسری طرف نصیر السلام، حسینہ، بوستان اور گلزار جیسے کردار بھی دکھائے ہیں۔ یہ کردار توہم پرست معاشرتی فکر کے تضادات، عقیدے کی ناپختگی شریعت اسلامی کی اصل روح کو نہ سمجھ پانے

والوں کی روداد ہے۔ محمد الیاس نے جہاں ایک طرف مثبت فکر کرداروں کا ذکر کیا ہے اور اسلام کی باتیں کرنے والے نام نہاد مذہبی ٹھیکداروں کے دوغلے پن کو بیان کیا ہے۔ وہیں حضرت علیؑ کی سیرت، فکر اور اقوال کی روشنی میں امتِ مسلمہ کو سیدھی راہ دکھانے کی سعی بھی کی ہے۔

اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مذہب ہمارے معاشرے میں رسم ورواج اور اعمال وافعال کا بنیادی جزو ہے۔ اور اس کی عمل داری اس حد تک ہے کہ انسان کی پیدائش سے لے کر وفات تک ہم چاہتے ہیں کہ ہر جگہ پہ مذہب کا حوالہ ہو۔ اس کے فکری پس منظر سے قطعِ نظر یہ بات طے ہے کہ ہماری زندگیوں میں مذہب کی عمل داری مکمل طور پر موجود ہے۔ مذہب کی اس عمل داری کے دو پہلو ہمیں محمد الیاس کے ناول میں ملتے ہیں ایک مثبت اور منفی۔ گویا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ مذہب کی عمل داری اگر مثبت ہو تو وہ سماج کی بنت کو مضبوط اور سماج کو عافیت کا خیمہ بنا دیتی ہے لیکن بد قسمتی سے ہمارے ہاں اس کی منفی صورت موجود ہے اور مذہب کی اس عمل درای کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سادہ لوح عوام کا معاشی، سماجی حتیٰ کہ جنسی استحصال بھی کیا جاتا ہے۔

محمد الیاس کے ناولوں میں معاشرتی مسائل کی ایک بڑی وجہ سماجی بندشیں اور طبقاتی تقسیم نظر آتی ہے۔ معاشرے میں بہت سے طبقوں اور بالخصوص عورت کو مختلف سماجی بیانیوں کے ذریعے استحصال کا شکار بنایا جاتا ہے۔ عورت بالخصوص اور ہر فرد بالعموم بہت سی فطری خواہشات کی ناآسودگی اور فطری ضروریات سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ معاشرہ معاشی، اقتصادی اور نسلی اعتبار سے کئی ایک اکائیوں میں بٹ گیا تقسیم نے تعصب کی صورت اختیار کر لی اور نتیجتاً معاشرے میں تخریب، عدم توازن، استحصال اور بغاوت نے جنم لیا۔ یہ رویے اور بہت سی سماجی برائیوں کا سبب بنتے ہیں۔ محمد الیاس بات سے بخوبی آگاہ ہیں، لہذا وہ اپنے ناول میں ان سب کے محرکات کے طور پر موجود سماجی بندشوں اور طبقاتی مسائل کو مختلف کرداروں کے ذریعے اجاگر بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی تنقید اور ان کے سدباب بھی سوجھاتے ہیں۔

ج۔ سماجی بندشیں اور طبقاتی تقسیم کے اثرات

برصغیر کے معاشرے اور پاکستانی معاشرہ اگرچہ اس بات کے دعویدار ہیں کہ یہاں پر مذہب کی عمل داری ہے۔ لیکن جب ان معاشروں کی تہہ میں اترتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہاں تو مذہب کا صرف نام لیا جا رہا

ہے۔ مذہب بطور کاروبار خوب تر ہے۔ مذہب کی حقیقی روح اس کی رسائی کہیں نہیں ہے۔ یہ معاشرے آج بھی قبائلی عہد کی یادگار ہیں۔ ان معاشروں پر ہندوانہ رسم ورواج، ہندو معاشرتی اقدار، ہندو فکر اور ہندوانہ رسم ورواج آج بھی اسی طرح مسلط ہیں۔ جس طرح کبھی تھے۔ یہاں پر کتنے ہی مذاہب آئے۔ لیکن بدقسمتی دیکھئے مذہب کے ماننے والوں نے مذہب کا ڈھنڈورا بہت پیٹا۔ لیکن مذہب پر عمل درآمد نہ کر پائے اور ہندوانہ معاشرتی اقدار یا رسم ورواج یا ان کے منفی معاشرتی رویے صدیوں سے چلے آرہے تھے۔ وہی چلتے رہے۔

ہندو سماج کا جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ یہاں پر عورت محض ایک کھلونا اور تسکین کا ذریعہ تھی۔ اس کی عزت و تکریم مرد کے دم سے تھی۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت تھی نہ ذات۔ اس کی مرضی کے فیصلے میں کہیں دخل نہ تھا۔ اگر مرد مر جاتا تو اس کی بیوی کو اس کے ساتھ چتا میں جلنا پڑتا تھا۔ پھر انتہائی خوفناک اور بھیانک موت کو اعزاز تصور کیا جاتا تھا۔ جب آگ عورت کو جلانے لگتی اور وہ چتا سے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتی تو اسے پکڑ کر آگ میں ڈال دیا جاتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت کی موت پر اس کا شوہر بھی چتا میں جلتا یا پھر عورت کی چتا کو آگ لگا کر وہ ایک اور عورت کے خواب بُننے لگتا تھا۔ یہ اکیسویں صدی ہے اور دنیا ذہنی و فکری ترقی کی بلند ترین منزلوں پر پہنچ گئی ہے۔ انسان نے مریخ اور مشتری پر کمندیں ڈالنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ہندوانہ معاشرہ اس جدید دور میں بھی بیٹی کی عزت اور عظمت کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق بھارت کے اندر ایک کثیر تعداد ایسی عورتوں کی ہے جو الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے معلوم کر لیتی ہیں کہ ان کے ہاں بیٹی کا تولد ہونے والا ہے۔ تب وہ اسقاطِ حمل کروا لیتی ہیں۔ عورت کی بے توقیری ویسے تو تقریباً دنیا کے سبھی معاشروں میں رائج رہی ہے۔ یورپ کی تاریخ کا مطالعہ کریں، مصر کی تاریخ ہو، عربوں کی تہذیبی تاریخ تاریخ پڑھیں کسی بھی خطے میں مردوں نے عرصہ دراز تک عورتوں کی تکریم کرنا نہیں سیکھا۔ آج جب دنیا اپنے آپ کو مذہب قرار دیتی ہے۔ خواتین کے ساتھ آج بھی غیر مساویانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ برصغیر سمیت دنیا کے بہت سے علاقوں میں خواتین کو انسان ہی نہیں تصور کیا جاتا۔

اردو ادب سمیت ادبیات عالم معاشرے کے اندر عورت کے وجود پر سوالیہ نشان کے بارے میں ہمیشہ سے بحث کرتا آیا ہے۔ شاید مذاہب کے بعد ادب ہی وہ میدان ہے جس نے خواتین کو نہ صرف یکساں حقوق دیئے بلکہ خواتین کی ذات کے حوالے سے کھل کر بحث کی ہے۔ اس پر عمل کرنے والوں کا ایک ہی مقصد تھا کہ عورت پر کئی طرح کی بندشیں عائد کی گئی ہیں۔ کس طرح سے اسے ہر لمحہ محبوس کرنے کی کوششیں جاری رہتی ہیں۔ ان پر قدغن لگائی جائے۔ اس مردانہ معاشرے کو یہ یقین دلایا جائے کہ خواتین بھی انسان ہوتی

ہیں۔ ان کے حقوق بھی مردوں سے کم نہیں ہیں۔ اردو زبان وادب میں ڈپٹی نذیر احمد ہوں، راشد الخیری ہوں اور بعد ازاں خواتین قلم کار خاص طور پر سبھی نے خواتین کے حقوق کی بات کی ہے۔ یہ ایک ادبی روایت بن چکی ہے۔ محمد الیاس اس ادبی روایت کا اہم حصہ بن گئے ہیں۔ ان کے ہر ناول میں کسی نہ کسی طریقے سے کوئی ایسا کردار ضرور تخلیق کیا گیا ہے جو خواتین کے مقام و مرتبے کا عکاس ہوتا ہے۔

"کُہر" محمد الیاس کا ایک ایسا ناول ہے۔ جس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بہت سے خواتین کردار پاکستانی معاشرے کے عکاس ہیں۔ جب یہی کردار اپنے اوپر عائد بندشیں دیکھتے ہیں تو انہیں بغاوت کی سوجھتی ہے۔ کیونکہ آج ہم اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں اور اس صدی میں تعلیم کا معیار نیز انسانی شعور کی پختگی گزشتہ کئی صدیوں کی نسبت بہت بڑھ گئی ہے۔ اب جب عورت کو حقوق نہیں دیے جاتے تو وہ بغاوت پر اتر آتی ہے۔ یا پھر اپنی بے توقیری اور اپنے اوپر عائد بے جا بندشوں کا بدلہ کسی اور انداز میں لیتی ہے۔ "کُہر" کے اندر بہت سے خواتین کردار موجود ہیں۔ جو معاشرے میں پلنے والی اسی روش کے آئینہ دار ہیں۔ ایک بہت خوبصورت کردار مارگریٹ کا ہے۔ مارگریٹ عیسائی قبیلے کی فرد ہے۔ اپنے محبوب اکرم کے لیے جذبات رکھتی ہے۔ لیکن اس متعصب معاشرے میں اسے دو حوالوں سے سزا دینے کی کوشش کی جاتی ہے ایک حوالہ تو یہ ہے کہ وہ طبقہ نسواں سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری وجہ وہ غیر مسلم ہے۔ ایسے معاشرے کے بارے میں محمد الیاس لکھتے ہیں:

> "بعض انسانوں کی سرشت میں کمینگی پھپھوند کی طرح پھیل رہی ہوتی ہے۔ جس سے دماغ کے روشن خلیے آلودہ ہونے لگتے ہیں ایسے میں ان کا اپنا ہی ہمزاد ان کی سوچوں پر ٹانگ اٹھا کر بار بار پیشاب کرتا ہے تو جا بجا ککرمتے اُگ آتے ہیں۔ گندگی اور سڑاند زدہ ایسے ہی مغلظ اور تاریک گوشوں میں حرص و ہوس کے کیڑے کلبلانے لگتے ہیں۔"[۱۴]

خان اسلم کا ملازم صوفی اور ڈرائیور مارگریٹ کو زدو کوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تب وہ صوفی کی تہبند (چادر) تک ساتھ لے چلی جاتی ہے وہ شرمندہ ہو کر بھاگ کر خان اسلم کی گاڑی میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ ڈرائیور اس پر راڈ سے حملہ آور ہوتا ہے اور وہ اسے پتھر مارتی ہے۔ اس کے بعد خان اسلم اپنے اندر اتنی ہمت نہیں کر پاتا کہ گاڑی سے باہر آ کر مارگریٹ پر تشدد کرے۔ مارگریٹ ایک مظلوم کردار ہے۔ اسے عیسائی طبقہ ناپسند کرتا ہے کہ وہ ایک مسلمان سے پیار کرتی ہے اور مسلمان اس لیے ناپسند کرتے ہیں کہ وہ عیسائی ہے۔ ایک مقام پر خان اسلم کی بیوی زرینہ کہتی ہے کہ اس کا بیٹا اکرم کہیں باہر کے ملک میں پڑھنے چلا جائے اور کسی

انگریز خاتون سے شادی کر لے۔ محمد الیاس نے یہاں زرینہ کے دوہرے معیار کو دکھاتے ہیں۔ لیکن وہی زرینہ مارگریٹ کے خلاف ہو جاتی ہے۔ آخری دم تک وہ مارگریٹ کے خلاف محاذ کھڑا کیے رکھتی ہے۔ مارگریٹ ان بندشوں کے خلاف آخری وقت تک کھڑی رہتی ہے۔

مارگریٹ اور اکرم کی ملاقات نگار کے ساتھ ایک تفریحی مقام پر ہوتی ہے۔ شب بسری کے نتیجے میں مارگریٹ اکرم کی بیٹی سارہ کی ماں بن جاتی ہے۔ یہ معاشرے کے خلاف اور معاشرتی بندشوں کے خلاف بہت بڑی بغاوت ہے۔ اسی طرح مارگریٹ جب انگلستان جانے لگتی ہے تو اس سے پہلے جلد بازی میں اکرم سے نکاح کر لیتی ہے تاکہ آنے والے بچے کو قانونی تحفظ فراہم کیا جائے۔ نیز ان دونوں کے درمیان پروان چڑھنے والی محبت کو تکمیل دی جائے۔ مگر جب بازار سے گزرتی ہے تو بہت سے مرد اس پر جملے کستے ہیں۔

"راہ چلتے ہوئے جا رہی ہوتی تو کئی منچلے کہتے۔" یار! کالی سانولی رنگت والی اتنی پُرکشش
لڑکی نہیں دیکھی لیکن اس سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ بچے کے عشق میں
گرفتار ہے اور زمانے سے بیزار۔"[۱۵]

محمد الیاس نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس مردانہ معاشرے کی فطرت کو بیان کیا ہے۔ مرد جب چاہے، جہاں چاہے اور جس کے ساتھ چاہے آزادانہ گھوم پھر سکتا ہے۔ گھر میں بیوی بچے ہونے کے باوجود اس کے کردار پر حرف گیری نہیں کرتا لیکن جیسے ہی عورت کو مرد کے ساتھ دیکھتا ہے تو اسے بدچلنی کا سرٹیفیکیٹ دے دیتا ہے۔ ایسا ہی مارگریٹ کے ساتھ ہوتا ہے۔

ایک ریٹائرڈ پروفیسر سکول کھولنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے انٹرویو کرتا ہے۔ مارگریٹ بھی وہاں جاتی ہے۔ وہاں پروفیسر اس سے دست درازی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک ساٹھ سالہ مرد ایک بیس سالہ لڑکی سے دست درازی کی کوشش کرتا ہے۔ جس کے جواب میں مارگریٹ اسے جوتا مار دیتی ہے۔ یوں محمد الیاس نے ناول میں عورتوں کی آزادی اور ان کی مظلومیت کے ختم ہونے کے احساس کو بارہا بیان کیا ہے۔

"موصوف نے کرسی آگے کھسکا کر پیٹ میز کے تختے سے لگاتے ہوئے دونوں قدم اور
ہاتھ ایک ساتھ آگے بڑھایا تو پلک جھپکنے میں جو تا بن بالوں کے چمکتی ہوئی ٹنڈ پر پڑا"[۱۶]

یہ ایک ایسے معاشرے کی کہانی ہے۔ جہاں کے مرد عورت کو جب بھی دیکھتے ہیں ہوس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں عورت کی بطور ماں بہن بیٹی کے کوئی توقیر نہیں۔ مارگریٹ ایک دبنگ لڑکی ہے۔ ورنہ اس معاشرے کے اندر جس طرح کا سلوک مارگریٹ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اگر کسی عام لڑکی کے ساتھ کیا

جاتا تو شاید وہ مر جاتی۔ اکرم ذوالقرنین مارگریٹ سے ملنے اس کے گھر جا پہنچا۔ دونوں باتیں کرنے لگے اور جلد ہی مارگریٹ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اکرم اس کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ مارگریٹ نے یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ اس کے باوجود جس طرح سے عیسائی نوجوانوں اور کچھ مسلمانوں نے مل کر پولیس کو بلالیا اور اس پر غلیظ الزامات لگائے۔ نیز اخبارات میں اس پر شرمناک سرخیاں لگائیں۔

"رئیس شہر کا اکلوتا بیٹا عیسائی لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا گیا۔"[۱۷]

مارگریٹ کا میڈیکل کروایا گیا اور میڈیکل کرنے کے بعد اس کی پاکبازی ثابت ہونے کے باوجود اس کی ذات پر رقیق حملے کیے گئے۔ سول ہسپتال کی لیڈی ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد ہنس کر مارگریٹ کو دیکھا اور کہنے لگی۔

"رنگ رلیاں مناتے ہوئے تم کہاں رہی ہو۔"[۱۸]

یہ اس معاشرے کی بھیانک عکاسی ہے۔ جہاں اکرم کو مرد ہونے کی وجہ سے دبنگ قرار دیا گیا۔ لیکن مارگریٹ کو ایک فاحشہ کے روپ میں پیش کیا گیا۔ محمد الیاس ناول میں ایک اور اہم پہلو یہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں مختلف ایسے سماجی بیانیہ ترتیب دیے گئے ہیں کہ جن کی بنیاد پر مختلف طبقوں کو استحصال کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ایسے ہی بیانیوں کے نتیجے میں استحصال کا شکار ہونے والا ایک طبقہ عورت ہے۔ اس سماج میں عورت کی زندگی کے لیے کچھ ایسے بیانیے ترتیب دیے گئے ہیں۔ جن سے سماج عورت کو بغاوت کی اجازت نہیں دیتا اور بعض صورتوں میں ایک سماجی ماحول کے تحت عورت خود بھی ان سے نہیں نکل پاتی۔ انہی بیانیوں کے نتیجے میں جو عورت مسلسل استحصال کا نشانہ بنتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ ایسا راستہ چنتی ہے جو زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ اس عمل کو محمد الیاس کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> "جدید دور کے بیشتر معاشروں میں بھی عورت کو اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ سازی کا اختیار حاصل نہیں ہوا۔ اگر وہ ایسا کرتی ہے تو بہت سے محبت بھرے رشتے قربان کرنا پڑتے ہیں۔ جبر اور سختی کے بطن سے جھوٹ جنم لیتا ہے۔ جب مانگے سے حق نہ ملے اور بغاوت کا حوصلہ بھی نہ ہو تو تشنہ تکمیل آرزوئیں پوری کرنے کے لیے درپردہ چالبازی، مکاری اور عیاری کی راہ اختیار کی جاتی ہے۔"[۱۹]

کلثوم اس ناول کا ایک بہت ہی مضبوط کردار ہے۔ کلثوم اکرم کے والد خان اسلم کے مائن سردار ملک خدا بخش کی بیٹی ہے۔ دوچار مرتبہ خان ہاوس آچکی ہے۔ اگرچہ وہ خود پریوں کی مثل ہے۔ لیکن اکرم پر فریفتہ ہے۔ لیکن اکرم اس کی جانب نہیں دیکھتا۔ خان اسلم اورزرینہ عمرہ پر چلے جاتے ہیں۔ جلال کے ساتھ اکرم سردار سے ملنے اس کے گھر ایک پہاڑی مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات کلثوم سے ہو جاتی ہے۔ جلال واپس چلاجاتا ہے۔ کلثوم جھوٹ بولتی ہے کہ اس کے والد آجائیں گے۔ اکرم وہیں ٹھہر جاتا ہے۔ پھر جس طرح سے وہ اپنے محبوب کوخوش آمدید کہتی ہے اوراپنی ذات کواس کے حوالے کر دیتی ہے یہ ایک معصوم فطرت لڑکی کی اس معاشرے کے خلاف بغاوت ہے۔ جواس کے سب سے بڑے حق شادی کے بارے میں اس کے متوقع شریک حیات کے بارے میں دریافت کرناپسند نہیں کرتا۔جب کلثوم کہتی ہے کہ اسے خالد سخت ناپسند ہے اور اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی پسند کے قدموں میں اپنی ذات کو بچھادے اور خالد کے پاس گویا کہ اس کے محبوب کی اترن پہنچے۔

کلثوم اکرم سے پیار کرتی ہے اور بعد ازاں اس کا اظہار بھی کر دیتی ہے۔ اس کی شادی ایک ایسے مرد کے ساتھ ہوتی ہے۔ جسے وہ دل سے ناپسند کرتی ہے لیکن ان سب کے باوجود اپنے شوہر کے حضور تسلیم ورضا کا پیکر بن کر رہتی ہے۔ خالد ملک انتہائی منفی کردار ہے۔ وہ اسے اپنے گھر میں بند کر کے رکھتا ہے۔ ٹیلی فون بھی تالے میں رکھ کر جاتا ہے۔ اس پر پہرے بٹھائے ہوئے ہیں۔ نیز اس پر چھڑی سے تشدد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ وہ طرح طرح کی دوائیاں کھا کر جنسی تشدد کانشانہ بناتا ہے۔ ایک بار جب خالد ملک نے اسے چھڑی سے پیٹااوراس کے بازوپر نیل پڑ گئے اوراسی دن اس کاوالد بھی آیا۔ کلثوم نے اپنے والد کو وہ نیل دکھائے۔ اس کے باوجود اس کے والد نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی اوراپنی بیٹی کو قصوروار خیال کیا۔

> "بیٹی! ایک بات یادرکھو۔ خاوند کو اللہ پاک نے بڑا مرتبہ اور مقام دیا ہے۔ بعض حالات میں بیوی کو سزا دینے کی اجازت ہے۔ تمہیں یاد ہو گا کہ میں خود بھی تمھاری ماں کو کبھی کبھی مارا کرتا تھا، جب اس سے کوئی غلطی ہو جاتی۔ عورت کی عقل ناقص ہوتی ہے اس لیے مرد کو کبھی کبھی ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے۔"[۲۰]

یہ ایسے معاشرے کی داستان ہے جہاں شوہر اس وجہ سے اپنی بیوی کو ظلم و تشدد کانشانہ بناتا ہے کہ وہ کسی اور مرد کی محبت میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اور باپ اپنی بیٹی کو اعتدال میں رکھنے کے باوجود خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں عورت کے کوئی حقوق نہیں۔ اگر اس معاشرے کی عورت بندشوں کو اگر توڑ نہیں

پاتی تو بغاوت کر جاتی ہے۔ کلثوم نے جیسے تیسے یہ کامیابی حاصل کر لی اور اپنی اولاد نہیں ہونے دی۔ جب چاہا کہ اولاد ہو تو وہ اولاد اکرم ذوالقرنین کی تھی۔ جس سے وہ اپنی جی جان سے چاہتی تھی۔ کلثوم اس معاشرے کا ایسا باغی کردار بن گیا جس نے اپنے ظالم سفاک شوہر خالد ملک کو قتل کر ڈالا۔

"کلثوم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پلک جھپکنے پر آگے بڑھ کر دھکا دیا اور ان ہیلر چھین کر بیڈ کے پار پھینک دیا۔ وہ دوبارہ صوفے میں دھنس گیا۔ شال اٹھا کر اس کے سینے اور بازوؤں کو لپیٹ میں لیا اور صوفے کے پیچھے گرہ لگا دی۔ انجانے خوف سے خالد کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جبڑے کی ہڈیاں اکڑ گئیں اور منہ بند ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ سینہ جکڑ جانے سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی اور سانس کی بندش مزید بڑھ گئی۔ کلثوم پر جیسے پاگل پن کا دورہ پڑا تھا۔ دوڑ کر غسل خانے میں گئی اور روئی کا بنڈل اٹھا لائی۔ خاصی مقدار میں روئی رول پر سے اتار کر اس کے منہ میں ٹھونستے ہوئے بولی۔ اب دفعہ ہو جاؤ۔ بڑے خوش تھے ناں میرے محبوب کو کوڑے لگوا کر۔"[۲۱]

خود بھی اتنی سفاک ہو گئی کہ گھر میں شوہر کی لاش موجود ہونے کے باوجود وہ اکرم کے ساتھ زندگی کے حسین پل بتانے لگی۔ بعد ازاں اپنے بیٹے کو مارگریٹ کے حوالے کر دیا۔ جو اسے دیارِ غیر لے کر چلی گئی۔ کلثوم پر پہرے لگے ہوئے تھے۔ جب مارگریٹ سے ملنے کے بعد وہ لوٹ کر واپس آئی تو میکے اور سسرال والوں نے مل کر اسے قتل کر دیا۔ کسی نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کی ذات میں اتر کر نہیں دیکھا۔ اس کے کرب اور اس کے دکھ کو ناپنے والا کوئی نہیں تھا۔ صرف اسے دیوار میں چننے والے موجود تھے۔ یہ کردار ایک ایسے معاشرے کا ترجمان ہے۔ جہاں ہر روز بیٹیاں اسی طرح دیواروں میں چن دی جاتی ہیں۔ لیکن یہ معاشرہ نہ اتنا آزاد خیال نہیں کہ وہ عورت پر عائد پابندی ختم کرے۔

ناول کے اندر ایک زندہ کردار کبوتری کا کردار ہے۔ یہ اپنے والد کے کہنے پر عصمت فروشی کرتی ہے۔ عصمت بیچنے کے پانچ روپے وصول کرتی ہے۔ لیکن جب یہ جلال خان سے ملتی ہے تو اس کے ساتھ پیار کے بندھن میں بندھ جاتی ہے۔ اس نے اس وقت تک کی زندگی میں بارہ تولے سونا اپنے باپ سے چھپا کر اکٹھا کر رکھا ہوتا ہے۔ وہ سارا سونا بیچ دیتا ہے اور جو پیسہ ملتا ہے اسے جلال خان پر نچھاور کر دیتی ہے۔ کبوتری معاشرے کا رد کیا ہوا کردار ہے۔ وہ جلال کے والد خان بابا کی نظر میں گھٹیا طبقے سے ہے۔ اگرچہ یہ کردار عصمت فروش کا

کردار ہے لیکن جس وقت وہ سونا بیچتی ہے۔ نیز جلال خان کے والد کے پاس اپنے والد کے جانے کے بارے میں جانتی ہے۔ باپ کو مار ڈالتی ہے۔ عدالت میں پیش ہو کر اقبالِ جرم کر لیتی ہے۔ تب یہ کردار ایک تابندہ کردار بن جاتا ہے۔ ایک جگہ جلال خان شیر دل سے کہتا ہے کہ کبوتری کا جیل میں خیال رکھنا۔ کیونکہ جیلوں کے اندر خواتین کے ساتھ اس کی عصمت کے ساتھ بدترین سلوک ہوتا ہے۔

"بات صرف اتنی ہے کہ میں اسے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا۔۔۔ جیل میں اس کے ساتھ زیارتی نہ ہو۔ ہم جیسی قوموں میں لاوارثوں کے لیے ریاستی ادارے عقوبت خانے ہی تو ہوتے ہیں۔ اسے لوٹ کا مال سمجھ کر چھوٹے بڑے کارندے ادھیڑ کر رکھ دیں گے "[۲۲]

یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جو اپنی قیدی عورتوں کو بھی نہیں بخشا وہ کس قدر بھیانک معاشرہ ہے۔ کبوتری جیل چلی جاتی ہے۔ لیکن اپنے محبوب کے ساتھ مخلص رہتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کبوتری عصمت فروش کیوں بن گئی۔ کیا اس معاشرے میں صرف کبوتری قصوروار ہے۔ وہ مرد پاکیزہ اور پاوتر ہے۔ جو دس روپے لوٹانے کے لیے اس سے رجوع کرتا ہے۔ کیا یہ کردار کسی شریف آدمی کا شریکِ حیات نہیں بن سکتا۔

محمد الیاس نے کبوتری کے کردار کے ذریعے ایک تلخ حقیقت کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کردار کے ذریعے انھوں نے عورت کی بے بسی اور لاچاری کو بیان کیا ہے۔ کبوتری ایک جگہ جلال خان کے ساتھ مکالمہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ میرے باپ کی پرواہ نہ کرو۔ نامعلوم وہ میرا باپ ہے بھی کہ نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے مجھے اغوا کیا ہو اور اب کمائی کا ذریعہ بنالیا ہو۔

"رب جانے وہ میرا باپ ہے بھی یا نہیں۔ ہماری ذات کے لوگوں میں باپ بھائی کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ لڑکا پیدا ہو جائے تو سوگ منایا جاتا ہے اور لڑکی کی پیدائش پر جشن۔ میں نے ماں کی گود دیکھی بھی نہیں، کیا خبر اس نے مجھے کہاں سے اٹھایا ہو۔ اپنی بیٹی نہ ہو اور کوئی بچی ان کے ہاتھ لگ جائے تو یہ لوگ راتوں رات ہجرت کر جاتے ہیں ۔۔۔ اور یہ لوگ پرچہ کبھی بھی نہیں درج کرواتے۔ خود ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ وہ بھی جب مایوس ہونے لگیں۔ ورنہ آس لگائے بیٹھے رہتے ہیں کہ خوب مال کما کر لوٹے گی۔ "[۲۳]

کبوتری کا یہ بیان الارمنگ ہے۔ کبوتری کا یہ بیان الارمنگ ہے۔ کیونکہ معاشرے کے اندر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ظالم سماج کے بہت سے ظالم کارندے معصوم بچیوں کو اغوا کرتے اور ہوس گاہوں پر بٹھا دیتے ہیں۔ انہیں اپہاج بنا دیتے ہیں۔ کبوتری ایسا ہی ایک کردار ہے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ مبنی بر حقیقت ہے کہ اس معاشرے میں کئی باپ اپنی بیٹیوں سے دھندا کرواتے ہیں۔ یا ان کے ساتھ جنسی طور پر ملوث ہوتے ہیں۔ محمد الیاس نے "کُہر" کے معاشرے کی دردناک حقیقتوں کو بیان کیا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ کبوتری ایک نہایت مظلوم کردار ہے۔ جس سے جلال خان تو پیار کر سکتا ہے کوئی اور نہیں۔

اسی طرح جلال خان کی والدہ کو جلال خان کے والد خان بابا نے جہاد کشمیر کے دوران قتل کر دیا اور کمسن بچی کے ساتھ زبردستی نکاح کر کے مسلمان بنالیا۔ جلال خان ہمیشہ اپنی ماں کے دکھ میں مبتلا رہا جبکہ اس کی ماں ایک ساتھ دو بچوں کو جنم دینے کے بعد موت کی آغوش میں جا لیٹی۔ خان بہادر کو زندگی بھر ایک لمحے کے لئے بھی اس معصوم لڑکی کا یا اس کی موت کا یا اس کے سامنے اس کے ماں باپ کو قتل کرنے کا پچھتاوا نہیں ہوا۔ ۲۴

یہ ایک مظلوم عورت کا درد ہے جو ایک سفاک معاشرے کی بلی چڑھادی جس سے اس کے مذہب کا پوچھا گیا نا شادی کے لیے مرضی کا۔ ایک ایسا مرد جو ایک خاتون کے سامنے اس کے ماں باپ کو قتل کر کے وہ خاتون اس سے کس قدر نفرت کرتی ہو گی، لیکن یہ درد بھی اس معاشرے کا حصہ ہے۔ جلال خان کی بہن ایک اور خاموش کردار ہے، جس کی شادی اس سے دریافت کئے بغیر عمر میں اس سے دو چند فرد کے ساتھ طے کر دی جاتی ہے۔ خان بابا نے اپنی بیٹی کو بھی قربان کر دیا اور اپنے بیٹے کو بھی ۔ جلال خان اپنی بہن کے حقوق کے حصول کی خاطر قتل ہو گیا۔ معاشرے کے نام نہاد کرداروں نے ایک بھائی کو اس لئے قتل کر دیا کہ وہ اپنی بہن کے حقوق کا محافظ بننے کی کوشش کرتا رہا۔ قابلِ مذمت ہے کہ عورتوں کے حقوق دینے کے بجائے ان پر حد سے زیادہ بندشیں عائد کی گئی ہیں اور اس پر معاشرہ کا یا کلپ بن جاتا ہے۔ محمد الیاس نے اپنے ناول میں بہت واشگاف الفاظ میں سماج کی اس سفاک فطرت کو بیان کیا ہے۔

د۔ اخلاقی اقدار کا انحطاط

درج بالا تجزیے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں طبقاتی تقسیم سماجی بندشیں اور معاشی ناہمواریوں نے فرد کو داخلی طور پر کئی مسائل سے دوچار کیا ہے۔ دولت، اقتدار، اختیار اور سماجی مقام یہ

وہ حوالے ہیں۔ جن کے لئے سماج کے مختلف افراد دوسروں کی دیکھا دیکھی جائز اور ناجائز کے فرق کو مٹاتے ہوئے کسی بھی صورت میں اپنا مقام پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی دُھن انہیں اخلاقی انحطاط کا شکار بناتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک حوالہ بنیادی فطری خواہشات کی ناآسودگی بھی ہے۔ یہ ساری پیچیدگیاں مجموعی طور پر معاشرے کو اخلاقی پستی کی طرف لے جاتی ہیں۔ محمد الیاس ان تمام حوالوں سے معاشرے میں موجود اخلاقی برائیوں کو کچھ ایسے اجاگر کرتے ہیں کہ اس کے پس منظر میں موجود محرک خود بخود سامنے آجاتے ہیں۔ ایک اور حوالہ جو ہمیں اخلاق باختگی کے عام ہونے میں ممد و معاون نظر آتا ہے وہ ہے صاحبِ ثروت لوگوں کے لئے احتساب اور قانون کی گرفت کا ڈھیلا ہونا۔ اس کی وجہ سے معاشرے کے بہت سے افراد اپنی سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے استحصال کو برداشت کرتے ہیں۔

اللہ العزت نے اپنے مقدس کلام میں ارشاد فرمایا "اِنَکَ لَعَلٰی خُلُق عَظِیم "[۲۵] محمد مصطفی ﷺ کی پوری زندگی پیکرِ اخلاق تھی کیونکہ آپ ﷺ نے قرآنی اخلاقی تعلیمات سے اپنے آپ کو مزین کیا تھا۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے۔ "تم میں بہتر وہ ہے جو تم میں اخلاق کے اعتبار سے بہتر ہے۔" لیکن معاشرے میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ جو خوش مزاج ہے وہی خوش اخلاق ہے۔ لیکن جب قرآن اور حدیث مبارکہ سے رجوع کیا جاتا ہے تو صورتحال مختلف نظر آتی ہے۔ اخلاق کسی بھی معاشرے کی زندگی کا ضامن ہوتا ہے۔ لیکن آج کا معاشرہ اخلاقیات، تہذیب و تمدن اور تربیت و تادیب سے عاری ہو چکا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ یہ اخلاقی بگاڑ ہمیں دیمک کی طرح کھا رہا ہے۔ دینِ اسلام جس کی حقیقی پہچان اخلاقیات کا عظیم باب تھا۔ جس کی تکمیل کے لیے حضرت محمد مصطفی ﷺ مبعوث کیے گئے تھے۔ اسی دین کے ماننے والے اخلاقی پستی کے اس درجے پر پہنچ چکے ہیں کہ آج معاشرے میں ظلم و زیارتی، حسد، کینہ بغض، حق تلفی، مفاد پرستی عام ہے ہوس کے اڈے، رشوت، دھوکہ دہی، لالچ اور حرص جیسی اخلاقی برائیاں عام ہیں۔ محمد الیاس انہی زوال پذیر اقدار کا مرثیہ لکھ رہے ہیں۔ لمحہ موجود میں ہر انسان دوسرے انسان کی دولت کو ہوس میں مبتلا دھوکہ دے رہا ہے۔ اکرم بھی اسی اخلاقی برائی کا شکار ہوا۔ جب ایک فرڈیا نقوی جھوٹ بول کر اکرم کی ہمدردی حاصل کر کے

نیز دھوکہ دہی اور حیلے بہانوں سے رقم بٹورتا ہے۔ جب اسے کوئی نیا بہانہ نہیں سوجھتا تو وہ عجیب منطق گھڑ لیتا ہے۔ اکرم سے اس کا یہ مکالمہ اس کی اخلاقی پستی کو بخوبی واضح کرتا ہے۔

> "لیکن دو مہینے کے بعد ہی دوسرا بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ کم از کم دس بارہ مہینے کا وقت نہیں لگنا چاہیے تھا؟۔۔۔ بس عزیز محترم کیا بتائیں یہ مفلسی بڑی لعنت ہے۔ دو ماہ پہلے آپ سے ڈیڑھ سو روپے لے کر گھر پہنچا بیوی کو فوراً ٹیکسی میں ڈالا اور ہسپتال لے گیا لیڈی ڈاکٹر نے ملاحظہ کیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی، بولی، مجھے افسوس ہے کہ زچہ اور بچہ دونوں بہت کمزور ہیں اور پھر آپ کی بیوی کے دودھ بھی نہیں اترتا۔ بچے کے لیے جو دودھ میں مناسب سمجھتی ہوں وہ مہنگا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ فی الحال زچہ و بچہ کی مناسب نگہداشت نہیں کر سکتے تو میں ایک انجکشن لگا کر دو مہینے کے لیے زچگی کا عمل موخر کر دیتی ہوں۔"[۲۶]

ہر عہد میں کسی بھی معاشرے کے اندر کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کی کمائی پر نظر رکھتے ہیں اور مال بٹورنے کی تاک میں رہتے ہیں۔ ذوالقرنین جیسے سادہ لوح انسان ایسے شاطر ذہن لوگوں کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جب اخلاقی اقدار کا انحطاط شروع ہو جائے تو معاشرے ثقافتیں اور تہذیبیں بھی مردہ ہو جاتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آج اخلاقی اقدار کا بگاڑ ہماری زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو چکا ہے۔ اخلاقی اقدار ، منافقت، دیانت، وعدہ خلافی، صداقت، بدکاری، عورتوں پر ظلم و ستم، انصاف شناسی وغیرہ کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ ظلم و ناانصافی، کرپشن اور بد عنوانی جیسے ناسور معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ افراد معاشرہ قومی درد اور خیر و شر کی فکر سے آزاد اپنی ذات اور مفادات تک محدود ہو چکے ہیں۔ یہ منفی رویے ہمارے قومی مزاج میں داخل ہو چکے ہیں جو معاشرے کے بگاڑ کا سبب بن رہے ہیں۔

ابن خلدون "مقدمہ" میں بیان کرتا ہے کہ دنیا میں عروج حاصل کرنے والی قوم اچھے اخلاق کی مالک ہوتی ہے۔ برے اخلاق کی حامل قوم زوال کا شکار ہوتی ہے۔ آج ابن خلدون کی یہ بات درست ثابت ہوئی ہے عصرِ حاضر میں جو اقوام ترقی کی راہ پر گامزن ہیں وہ مثالی رویوں اور اخلاقی اقدار کا مظاہرہ کرنے کی وجہ سے ہی ہیں۔ لیکن پاکستانی قوم اس لیے پیچھے ہے کہ ہم اخلاقی اقدار کے معاملے میں بدترین انحطاط کا شکار ہو چکے ہیں۔ محمد الیاس اس اخلاقی انحطاط پر نوحہ کناں ہے۔ جب ملت فروش، ضمیر فروش اور ایمان فروش طبقوں کا باہم گٹھ جوڑ ہو جائے تو معاشرے کی اخلاقیات کا جنازہ حرام موت کی صورت میں نکلتا ہے۔

"خودکشی اگر حرام ہے تو میں اپنے بال بچوں سمیت اللہ کے حضور پیش ہو رہا ہوں۔ آخری کھانا کھانے کے بعد جو رقم بچ رہی وہ میری جیب میں ہے۔ اس میں سے ہمارے کفن دفن کا خرچہ پورا ہو جائے گا۔"[۲۷]

پاکستان کے زوال آمادہ معاشرے کا اصل مسئلہ اخلاقیات کا زوال ہے۔ کوئی فرد بھی جب معاشرے اور اس کے مختلف پہلوؤں کا بغور مشاہدہ کرتا ہے تو وہ اس بات سے قطعی انکار نہیں کر سکتا کہ واقعی ہمارا معاشرہ اخلاقی انحطاط کا شکار ہے۔ اس اخلاقی انحطاط کی ایک وجہ جنسی بے راہ روی ہے۔ لمحہ موجود میں آزادی کے نام پر جنسی آوارگی اور بے راہ روی کا چلن عام ہے۔ ناول نگار نے موجودہ دور میں پھیلی ہوئی بے حیائی اور جنسی بے راہ روی کو کلثوم اور اکرم ذوالقرنین، مارگریٹ اور ذوالقرنین، جلال اور کبوتری کی صورت میں بیان کیا ہے۔ محمد الیاس نے کلثوم اور ذوالقرنین کے جنسی تعلق کو بیان کر کے اخلاقی قدروں کے زوال کا نوحہ لکھا ہے۔ "کُہر" میں جنس نگاری کی مثال ملاحظہ ہو

"بس آج کی رات دامن بھر جائے تو ہمیشہ کے لئے صبر آجائے۔ اس عاشق دیوانی کو ایک بچہ درکار ہے۔ اپنے محبوب ذوالقرنین کا۔۔۔ صرف اور صرف ذوالقرنین کا۔۔ ۔دل سے عہد کیا تھا بچہ جنا تو آپ کا جنوں گی نہیں تو نامراد ہی دنیا سے ہی چلی جاؤں گی۔ آج کشکول بھر دیں، اللہ کے نام پر۔ روز روز ہاتھ نہیں پھیلایا جاتا شرم آتی ہے۔ آخر عاشقوں کی بھی انا ہوتی ہے۔ ذوالقرنین نے اسے سینے سے اتار کر بستر پر ڈالا اور دونوں گال پر ہلکی ہلکی چپت لگا کر ایک بھرپور بوسہ لیا۔"[۲۸]

فاضل ناول نگار کے نزدیک انسان اتنا لالچی ہو گیا ہے کہ وہ بغیر مطلب کے کوئی کام کرنے کو تیار نہیں ہر شخص دوسرے انسان کو دھوکہ دولت کے لالچ اور اپنے مفاد کے لیے دیتا ہے۔ محمد الیاس ناول میں اسی انسانی المیے کو بیان کرتے ہیں۔ مقصد کے حصول کی خاطر چال بازی اور مکاری سے زرینہ نے پاکھڑا پہلوان کو اپنا بھائی بنالیا جب مقصد پورا ہو گیا تو پاکھڑا اور اس کے خاندان سے نظریں پھیرنا شروع کر دیں۔ خان اسلم ۱۹۴۷ میں امرتسر سے اپنی شریکِ حیات کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان پہنچا۔ اس کے ہمراہ اس کے دوست بھی تھے۔ جو راستے میں شہید کر دیئے گئے۔ یہاں پہنچ کر خان اسلم مہاجر کہلایا۔ اس نے یہاں پہنچ کر محنت کی لیکن محنت کے علاوہ اس نے ابن الوقت بننے کا گر اچھی طرح سیکھ لیا۔ انسانوں کو دھوکہ دینا، ان سے کام لینا اور پھر مطلب پورا ہونے پر انہیں پھینک دینے کا ہنر اچھی طرح ازبر ہو گیا۔ یہی کچھ اس نے پاکھڑا پہلوان کے ساتھ کیا۔

اسلم مہاجر کا کردار دو طرح سے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ ایک معاشی ضرورت اور دوسرا پہلو ہوس ہے ہجرت میں لٹے پٹے شخص کو گھر اور چھت کی ضرورت تھی اور کسی دوست کی تلاش فطری امر۔ لیکن اس عہد کی شورش اسے موقع فراہم کرتی ہے تو وہ ضرورت سے ہوس کی طرف پلٹ جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ استحصال کی صورت میں نکلا۔ یہ عمل اسلم مہاجر کی زندگی میں بتدریج نظر آتا ہے۔ آغاز میں پاکستان میں اسلم مہاجر کو جو زمین ملی اس پر کچھ اور لوگ قابض تھے۔ چنانچہ اسے کسی ایسے شخص کی مدد درکار تھی۔ جو نہ صرف معاشرے میں عزت کا مقام رکھتا ہو بلکہ طاقت ور بھی ہو۔ پاکھڑا پہلوان کی صورت میں اسے مدد مل گئی۔ زمین ملنے اور دولت آنے کے بعد پاکھڑا سے نظریں پھیرنا شروع کر دیں۔ جب ضرورت ہوتی ہے تو انسان خوش اخلاق کا مرقع بن جاتا ہے، لیکن ضرورت ختم ہوتے ہی اس میں برائیاں جنم لینے لگتی ہیں۔

اسلم مہاجر کے کردار میں ہجرت کے حوالے سے منفرد پہلو یہ ہے کہ عملی طور پر ہجرت کے موضوع میں مہاجرین پر ہونے والے ظلم بیان کیے گئے۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مہاجر اختیار ملتے ہی استحصال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ یہ مسئلہ ہجرت سے زیادہ اخلاقی انحطاط کا ہے۔ عمومی ناولوں میں یکطرفہ استحصال کی پیشکش ایک طرح سے تعصب کو ہوا دیتی ہے۔ لیکن "کُہر" میں محمد الیاس کا سماجی شعور اس کو ایک غیر جانب دارانہ انداز میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس برائی کی رد بھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی متعصبانہ فضا بھی پیدا نہیں ہوتی۔ مظلوم سے ظالم بننے کے سبب کو مصنف نے بڑی عمدگی سے مرحلہ وار بیان کیا ہے۔ جس سے یہ عمل ایک اخلاقی برائی کے طور پر اپنا اظہار کرتا ہے۔ اس تسلسل میں آغاز میں جب پاکھڑا پہلوان نے بہت سی زمینوں پر قابض لوگوں کو باہر نکال دیا کیونکہ یہ زمینیں اسلم مہاجر کو الاٹ ہوئی تھیں۔ جب اسلم مہاجر ما مقصد پورا ہو گیا تو اس نے پاکھڑا پہلوان کو اس کے خاندان سمیت گھر سے نکال دیا۔ اسلم مہاجر کے اس رویے کے بارے میں ڈاکٹر جمیل حیات لکھتے ہیں۔

> "جب انسان بے بس ہوتا ہے تو وہ سہارا ڈھونڈتا ہے۔ اس وقت یہ نہیں دیکھتا کہ جو سہارا اسے مل رہا ہے وہ اس کا ہم مذہب، ہم مسلک یا ہم وطن ہے کہ نہیں۔ جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے تو پھر وہ سہارا دینے والے بھی نگاہیں پھیر لیتا ہے۔ خان

اسلم کے ساتھ بھی یہی المیہ ہوا کہ وہ اپنی عبادت گزار بیوی کے واہموں کا شکار ہو کر پاکھڑا جیسے پر خلوص دوست سے تعلق خراب کر بیٹھا جسے اس کی بیوی اپنی عبادت سمجھ کر نازاں ہوتی رہی۔ دولت آئی تو خوشامدی لوگوں کو ساتھ لائی۔ خان اسلم اس خوشامدی لوگوں میں ایسا گھرا کہ اپنے بیٹے کو بھی بھول گیا۔"[۲۹]

دوسری طرف معصوم اور بشیر جیسے وفاداروں نے اکرم کو کبھی تنہا نہیں ہونے دیا باوجود اس کے کہ وہ انتہائی غربت میں زندگی گزار رہے تھے۔ یہ وہ کردار ہیں جو اپنی صورتحال میں مثبت اقدار اور بہترین سماجی رویوں کی علامت ہیں۔ خان اسلم اور اس کی بیوی لالچ کی وجہ سے برائی کی طرف گئے۔

محمد الیاس ایک اور اخلاقی برائی کو بھی اخلاقی انحطاط میں شمار کرتے ہیں اور وہ حسد ہے۔ اسے وہ اخلاقی قدروں کے زوال کا سبب جانتے ہیں۔ حسد معاشرے میں کینہ، بغض، نفرت وعداوت کے بیج بوتا ہے۔ "کُہر" میں محمد الیاس نے اسی بیماری کو بیان کیا ہے۔ جس سے ایک طرف انسان کا جسم متاثر ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کا ایمان بھی جاتا رہتا ہے۔ ناول میں خالد ملک ایسا کردار ہے جو حسد کا شکار ہے۔ ذوالقرنین سے اسے خدا واسطہ کا بیر ہے جو اسے اس بات پر اکساتا ہے کہ وہ ذوالقرنین کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچائے۔ خواہ وہ راستہ حق ہو یا جھوٹ۔ جیسا کہ مصنف لکھتے ہیں:

"اکرم، جلال اور شفیع کا مریڈ سیاسی زوال کے بعد اپنی دردمندی کے لمحات کو فراموش کرنے کے لئے کسی گوشے میں مل بیٹھے اور شراب پینے لگے۔ تب خالد ملک نے کسی طرح سے اس محفل کا پتا لگالیا اور اطلاح فوجی منتظم تک پہنچادی۔ فوجی عدالت لگی۔ سب کو کوڑے مارے گئے۔ خالد ملک بہت خوش تھا۔ اسے پہلے ہی اکرم سے چڑ تھی۔ وہ ظاہراً تو اکرم سے دوستی کا دم بھرتا تھا لیکن باطنی طور پر وہ اس کا جانی دشمن تھا۔"[۳۰]

ان سارے کرداروں کو مجموعی طور پر دیکھیں تو جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ محمد الیاس سماج میں اچھے اور برے دونوں کرداروں کی جنگ دکھاتے ہیں۔ یہ جنگ خارج سے ہوتی ہوئی باطن میں اتر جاتی ہے اس جنگ میں اچھائیاں برائیوں میں کہیں تو ڈھل جاتی ہیں لیکن کہیں کہیں اچھائی برائی پر غالب آجاتی ہے۔

نفسانی خواہشات کی کثرت اور ان کے حصول میں استحصال کا رویہ اپنانے پر بھی کسی احتساب کے نہ ہونے نے اخلاقی اقدار کے زوال کو تیز کر دیا ہے۔ ضمیر کی آواز کو دبانے کے لئے انسان خود ساختہ بہانے گھڑ کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے، جیسا کہ خان اسلم اور اس کی بیوی پاکھڑا پہلوان کے استحصال کا جواز مذہب کو بنا کر اپنے ضمیر کی آواز کو دبا لیتے ہیں۔ محمد الیاس نے اخلاقی قدروں کے زوال کو دردمندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ "کُہر" میں موجود ان اخلاقی قدروں کے زوال کے حوالے سے بازغہ قندیل لکھتی ہیں:

> "آج کا انسان لڑ رہا ہے ایک دوسرے سے، فطرت سے، کائنات سے۔ اس کی باطن کی تاریکیوں اور گہرائیوں میں ایک جنگ جاری ہے۔ گناہوں کی دلدل کا خوبصورت راستہ اپنی بھرپور چکاچوند کے ساتھ نفس پر قابو پانے کے لئے موجود ہے، جو انسان کو بہلانے کے لئے کوئی نہ کوئی خوبصورت بہانہ گھڑ لیتا ہے۔"[۳۱]

اخلاقی قدروں کے زوال کی مثال کبوتری کا باپ اور جلال خان کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ان دونوں کے باپ پیسے کی ہوس میں مبتلا ہیں۔ کبوتری کا باپ اپنی بیٹی سے پیشہ کرواتا ہے تو جلال خان کا باپ اسے فارغ رہنے پر طعنہ دیتا ہے۔ حالانکہ جلال خان ۱۹۷۱ کی جنگ میں قیدی تھا۔ قید سے رہائی ملتے ہی گھر واپس آیا اور ریٹائرمنٹ کی رقم باپ کے حوالے کر دی۔ اس کے باوجود وہ جلال خان کو یہ طعنہ دیتا ہے اور کہتا ہے۔

"جو مرد روٹی نہیں کما سکتا اس سے تو گدھا اچھا ہے۔"[۳۲]

محمد الیاس کے ناول میں اخلاقی انحطاط کو تجزیاتی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کے پیچھے سماجی ناہمواریوں، طبقاتی تقسیم، صاحب ثروت اور صاحبِ اختیار کی اجارہ داری، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، معاشی مسائل اور سب سے بڑھ کر قانون کی عمل داری کا نہ ہونا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ان سب مسائل کا حل دو سطح پر ہے۔ ایک سطح داخلی ہے۔ اس کا حل محمد الیاس کی مذہب کے متعلق اور سماجی رویوں کے متعلق فکر میں پنہاں ہے۔ جنہیں مذہبی افکار کی عملداری اور سماج پر اس کے اثرات، طبقاتی تقسیم اور سماجی بندشوں کے تناظر میں بیان کیا جا چکا ہے۔ دوسرا ذریعہ نفاذِ قانون اور نظامِ حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ حل اس سماج سے مفقود کیوں ہے؟ اس کی وجہ محمد الیاس سیاسی مسائل کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ جس کو سمجھنے کے لیے سیاست اور سماجی اودار کے زوال کو ایک ساتھ پرکھنا ضروری ہے۔

د۔ سیاسی تغیر و تبدل کے نتیجے میں اعلیٰ سماجی اقدار کا زوال

پاکستانی معاشرے کے تناظر میں سب سے اہم نکتہ سیاسی نظام ہے۔ ملک کی سماجی و سیاسی پسماندگی میں مروجہ سیاسی نظام کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جس کی وجہ سے ملک ایسی تاریخی بدقسمت صورتحال میں پھنس چکا ہے کہ جس سے نکلنے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ وطنِ عزیز پر قابض ایلیٹ کلاس محض اپنے ذاتی اور گروہی مفاد کی خاطر اس ملک کو ترقی کی طرف لے جانے والے فکری نظام سے دور رکھے ہوئے ہے۔ جس کی وجہ سے ہم بحیثیت قوم ابھی تک اپنی شناخت کے شدید بحران کا شکار ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ملکی قیادت کوئی آئینی ڈھانچہ اور پالیسی تیار کرنے سے قبل ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور وطنِ عزیز پر اسٹیبلشمنٹ مسلط ہو گئی۔ جس نے اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے جمہوری اور سیاسی عمل سے ملکی قیادت کو پیدا ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنے مسائل کا خود تجزیہ کریں اور اپنے مستقبل کی راہوں کو متعین کریں۔ لہذا معاشی، خارجی اور سیاسی پالیسیاں بناتے ہوئے وطن عزیز کے مفادات کو قربان کرنا حکمرانوں کے لیے مسئلہ نہیں رہا۔ پاکستان کے معرض وجود میں آتے ہی سیاست میں اخلاقی زوال آگیا۔ اس زوال نے انسانوں کی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ۱۹۶۵ء اور اس کے بعد ملک میں سیاسی سرگرمیوں کا بازار گرم ہوا، عوامی احتجاج سے جس طرح آمر کو پسپائی ہوئی، جو جاتے جاتے اقتدار ایک جرنیل کے ہاتھ میں دے گیا، جس نے عیش پرستی کو اپنا مرکز و محور بنائے رکھا۔ محمد الیاس نے اس تمام کی تفصیل کو بیان کیا ہے۔ "کہر" میں ضیا دور کی تباہ کاریوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> "اعضاب بریدہ دیو اپنی حکمرانی قائم رکھنے کے لئے ظلم و ستم کی نئی تاریخ رقم کر رہا تھا۔ اس نے فرمان جاری کر دیا کہ صحیح عقیدہ وہی ہے جس کی سرکاری طور پر تشریح کر دی گئی ہے۔ جو اپنے ذہن کے مطابق تفہیم کرتا ہے وہ گمراہ ہے، گردن زنی ہے، اس نے دعوت عام دے دی کہ جو کوئی اس کا ہمنوا ہو جائے اسے سو خون معاف۔ وہ ہانچوں عیب شرعی کا مرتکب ہوا ہے، حقوق العباد پر ڈاکا ڈالنے کا عادی مجرم ہے۔ قومی خزانہ لوٹتا ہے۔ ہر طرح کی خیانت اور بد دیانتی اس کی رگوں میں کون کی طرح گردش کر رہی ہے لیکن وہ تخت دار پر کھینچے گئے عوامی قائد کی تکذیب کرے تو سمجھ لے کہ اس کی دنیا اور دین دونوں سنور گئے۔ جی بھر کے آسائشیں سمیٹ لے اور آئندہ زندگی میں بھی اس کی انگلی پکڑ کر ہم راہ جنت میں لے جائیں گے۔"[۳۳]

ذوالفقار علی بھٹو نے جمہوریت کا نعرہ لگایا تھا۔ اگرچہ محمد الیاس نے ذوالفقار بھٹو کا نام تو نہیں لیا۔ لیکن اسے عوامی لیڈر کے طور پر بارہا دیکھا یا ہے۔ یہ ایسا دور تھا جس میں عوامی لیڈر نے قوم کے نچلے طبقے کا جوش و جذبہ اپنی تقریروں سے بہت زیادہ بڑھا دیا تھا۔ عوامی لیڈر گویا کہ انقلاب پکار رہا تھا۔ عوام اس انقلاب پر صدقے واری جا رہے تھے۔ عوام نے بڑھ چڑھ کر اپنے قائد کو ووٹ دیئے۔ ان کے خیال میں اب نہ صرف قوم کی تقدیر بلکہ وطن کی قسمت بھی بدل گئی تھی۔ کارخانوں اور ملوں میں یونین بن گئی۔ قائد نے عوام کو حق مانگنے کا درس دیا۔ سب کا خیال تھا کہ اب ان کا حقیقی لیڈر آگیا ہے۔ اب ان کی زندگیوں کا رخ مڑ جائے گا۔ جلال خان، اکرم ذوالقرنین اور شفیع کامریڈ ایسے دوست تھے۔ جنہوں نے اس عوامی قائد کے حضور غائبانہ طور پر اپنے دل پیش کر دیئے تھے۔ اس کی پاداش میں جلال کو اپنے باپ کے طعنوں کا سامنا کرنا پڑا اکرم کے والدین اس سے مکمل طور پر ناراض ہو گئے۔ خان اسلم نے اپنے مل کے کتنے یونٹ مستقل بند کر دیئے۔ شفیع کامریڈ اور کئی مزدور نہ صرف بیروزگار ہوئے بلکہ انہیں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑ گئے۔ قوم کے نوجوان قائدِ عوام کی بھرپور اور پرجوش تقریروں کا رزق ہوئے۔ قائد عوام جاگیرداروں، وڈیروں اور گدی نشینوں کے آدرش کا رزق ہو گئے۔ بڑا سانحہ پیش آگیا تھا۔ جنہیں قائد عوام نے خواب دکھائے تھے۔ ان کے خواب ان کے لیے عذاب ثابت ہوئے اور قائد عوام اقتدار کے مزے لوٹنے لگے۔ یہاں تک بس نہ ہوئی۔ اس سے بھی ایک بڑا عذاب وآرد ہو گیا اور وہ تھا۔ بقول ناول نگار شکست خوردہ فوج کے جرنیلوں نے ایک بار پھر نامعلوم کس طنطنے سے ملک پر قبضہ جما لیا۔ وہ طوفانِ بدتمیزی برپا ہو کہ الامان الحفیظ۔ جاسوسی ہرکارے ہر کہیں پھیل گئے۔ دفتروں میں زبردستی نماز پڑھائی جانے لگی۔ ایسا اسلام سکھایا جانے لگا جس میں سراسر فائدہ جرنیل کا اور نقصان عوام کا تھا۔ نوجوان جن کی آنکھوں میں قائد عوام نے خواب بھر کر ان سے بینائی بھی چھین لی تھی۔ اس نئی آفت کو دیکھ کر نہ صرف ناامید ہوئے۔ بلکہ ان کے نظریات ان کے خیالات ان کے آدرش سب برباد ہو گئے اتنی مایوسی پھیلی جسے بیان کرنا ممکن نہیں۔

> "سوشلزم کا جنازہ دھوم دھام سے اٹھا۔ ایسا کہ تابوت تو عظیم الشان ہجوم کے جلو میں گلی گلی گھمایا گیا لیکن دفن کرنا یاد نہ رہا اور مردہ گل سڑ کر خراب ہوا تو سڑاند سارے میں پھیل گئی۔ بہت سے مخلص کارکن خون کے آنسو روئے۔ کئی دیوانوں نے اپنے لگے بندھے روزگار صرف اس اُمید پر قربان کر دیے تھے کہ بڑی تبدیلی رونما ہو گی تو ذاتی زیاں کا صدمہ خوشی میں ڈھل جائے گا۔ طالب علموں نے انقلاب دیوتا کے چرنوں میں

اپنا مستقبل ذبح کر دیا اور بہت سے چھوٹے بڑے رہنما بھی اجتماعی مفاد کے حصول کی خاطر بار بھلا کے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرے۔۔۔" غریب عوام کی پارٹی" مزدور کی پارٹی" "کسان کی پارٹی" پر جاگیر داروں کا تسلط قائم ہو گیا ہے اور عوام الناس وہی بے کسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں"[۳۴]

سیاست اگر سمجھ بوجھ اچھے نظریات زندگی اور سماج کے ساتھ برتی جائے تو ایک بہتر سماج کی تشکیل ہوتی ہے ورنہ اس کے خواب تجربے انسانوں اور ملک کو تباہ کر دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں لوگوں میں غم و غصے اور نفرت کا طوفان اٹھتا ہے۔ محمد الیاس "کُہر" میں ملک میں مارشل لاء لگنے سے لوگوں کی نفرت کو یوں بیان کرتے ہیں:

"خان ہاؤس میں اخبار پڑھ کر تمام حاضرین تبصرے کرتے تو پتا چلتا کہ خان بہادروں کی طرف سے مارشل لاء کے حق میں بڑے بیانات شائع ہو رہے ہیں۔ بڑے خان بہادر کے بیان پر سرخی جمائی گئی کہ مارشل لاء لگا کر ملک کو بچا لیا گیا ہے۔ صوفی کہنے لگا کہ خان بہادر کے خاندان کا جواب نہیں۔ پہلے انگریز حکومت کا دم چھلا رہے۔ جب ملک بننے والا تھا تو اس کی خالق جماعت میں آ گئے۔ مارشل لاء لگنے تک بھی حکومت میں رہے۔ اب مارشل لاء کے قصیدے پڑھنے لگے ہیں۔ لگتا یہی ہے کہ یہ لوگ اب مارشل لاء کے ساتھ مل کر حکومت کریں گے۔ ذوالقرنین پہلے ہی گھوڑے کو ملنے والی اذیت پر دکھی تھا لیکن اپ خان بہادر فیملی کی مارشل لا کے بارے میں پسندیدگی کا تذکرہ سن کر سخت خلاف ہو گیا۔ اس لئے دل میں سوچا مارشل لاء جو کوئی بھی ہے قطعاً اچھا نہیں چونکہ اسے خان بہادر جیسے بڑے لوگ پسند کر رہے ہیں تو یقیناً بہت برا ہو گا"۔[۳۵]

محمد الیاس کے ناول "کُہر" میں گہرا تاریخی شعور ملتا ہے۔ جو ناول میں پوری طرح اجاگر ہو کر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ "کُہر" میں تاریخی کے حوالے سے منشا یاد لکھتے ہیں:

"اس ناول میں ملکی تاریخ کے سارے ہی چیدہ چیدہ واقعات کے حوالے اور ان کے بارے میں جگہ جگہ مصنف کے خیال انگیز کومنٹس ملتے ہیں جیسے جنرل ایوب کا پہلا مارشل لاء، سوشلزم اور مساوات کے نام پر قائد عوام کی تحریک اور مرد حق کا کوڑوں کے ذریعے اسلام نافذ کرنا وغیرہ۔ کوڑوں کا صرف ذکر نہیں ہے بلکہ اس ناول کے ہیرو اور ساتھیوں کو کوڑے لگانے کا پورا احوال قلم بند ہوا ہے۔"[۳۶]

فوجی مارشل لاء کے دوران اسلامی نفاذ پر اخلاقی مجرموں کے ساتھ ساتھ سیاسی مجرموں کو کوڑوں کی سزا سنائی جاتی تھی اور اس پر من و عن عمل بھی ہوتا تھا۔ مارشل لا میں آمر ہی عدالت ہوتا ہے اور اس کا امر ہی قانون۔ ایسی صورتحال میں بہت سے لوگ جو اس آمریت کے دست و بازو بنتے ہیں۔ وہ خود ایک نجی آمریت کو وجود دیتے ہیں۔ اپنی ذاتی دشمنیوں اور اختلافات کو بدلہ چکانے کا یہ عہد انہیں پورا موقع فراہم کرتا ہے۔ سو وہ آمریت کا سہارا لے کر اپنے مخالفین کو مختلف خود ساختہ وجوہ بنا کر انتقام لیتے ہیں۔ جس کی مثال ہمیں اکرم اور اس کے والد کے کردار میں ملتی ہے۔ محمد الیاس نے ان تمام سیاسی حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔ اکرم کا باپ حکومت کا حصہ ہوتے ہوئے اپنے بیٹے کو سزا دلوانے میں پیش پیش رہتا ہے۔

> "سرسری سماعت کی فوجی عدالت کے سربراہ پر جب انکشاف ہوا کہ خان اسلم جیسا شخص جو اعلیٰ ترین ایوانِ اقتدار تک رسائی ہونے کے باوجود اپنے بیٹے کو قانون کے مطابق سزا دلوانے میں عدالت کا ساتھ دے رہا ہے تو فوری انصاف کرنے میں اسے ہچکچاہٹ نہ رہی۔ لیکن ایک صالح مسلمان کے بیٹے کی خاطر نرمی برتی اور تینوں کو پانچ پانچ کوڑے چھ ماہ کی سزائے قید اور باقی دونوں ملازموں کو اعانت جرم میں تین تین کوڑے اور ایک ماہ کی قید کا حکم سنایا۔ فیصلہ سنتے ہی عدالت کے حکم پر پانچوں مجرموں کو جیل پہنچایا گیا اور ڈیڑھ دو گھنٹے کے اندر اندر سب کو ٹکٹکی پر باندھ کر کوڑے لگانے شروع کر دیے گئے۔"[۳۷]

محمد الیاس برصغیر کے بالعموم اور پاکستانی معاشرے کے بالخصوص نبض شناس ہیں۔ وہ ان معاشروں کی بود و باش، رہن سہن، طرز عمل، ان خطوں میں رہنے والے لوگوں کے نظریات، محسوسات اور مشاہدات کو خوب سمجھتے ہیں۔ انھیں علم ہے کہ ان خطوں میں بالخصوص پاکستان کے اندر بہت کم ایسے رہنما پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اس ناآسودہ قوم کو آسودگی عطا کی۔ یہاں پر رہزن زیادہ اقتدار سنبھالتے رہے ہیں۔ نظریاتی رہنما نہیں بلکہ نظریات کا کاروبار کرنے والے رہنماؤں نے قوم کے خواب بار بار چکنا چُور کیے ہیں۔ یہاں پر تخلیقِ پاکستان سے پہلے پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ کا نعرہ لگایا گیا۔ کہا گیا یہ مملکت خداداد مدینہ کے بعد دوسری اسلامی نظریاتی ریاست ہے۔ لیکن افسوس تخلیقِ پاکستان کے بعد گذشتہ ۷۰ سالہ تاریخ میں یہاں پر ریاست مدینہ کے خواب دیکھے گئے۔ مگر ریاستِ مدینہ بنانے کی جانب کوئی گامزن نہیں ہوا۔ اسی طرح ایسے رہنما پیدا

ہوئے جنہوں نے انقلاب کے نعرے لگائے۔ جنھوں نے مساوات اور بھائی چارے کے نغمے تو الاپے لیکن ان پر عمل کرنا انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

تقسیم کے نتیجے میں فرقہ ورانہ تعصب اور کشت وخون کے مظاہر بھی ناول کا حصہ ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان تعصبات کو ہوا بھی ملتی رہی اور سیای عدم استحکام اور لا قانونیت نے اسے بہت پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا۔ ناول میں اس بتدریج سفر کو بیان کیا گیا ہے۔ بالخصوص ایک خاص عہد میں مارشل لاء کے دوران جہادی کلچر پروان چڑھا۔ جس کے نتیجے میں مسلکی عصبیتوں اور فرقہ پرستی کو فروغ ملا۔ اس فرقہ پرستی کو سرپرستی حاصل ہوئی تو پھر تقسیم کی طرح ایک کشت وخون کا بازر گرم نظر آنے لگا۔ فتووں کے زور پر لوگوں فکری آزادی غصب کی گئی اور بہت سی جانیں بھی اس کی نظر ہوئیں۔ اس سب عمل میں سیاسی منظر نامہ پوری تقویت اور حمایت کرتا نظر آتا ہے اور اپنے استحکام کے لیے مارشل لاء آمر بھی ان کے احتساب کی بجائے ان کے لیے اسباب فراہم کرتا ہے

ناول میں یہ بات واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے کہ سیاسی خلفشار کی صورت میں اپنی حکومت اور طاقت کے دوام کے لیے خود حکومت بہت سی برائیاں کرتی ہے اور ان سے صرفِ نظر کرتی ہے۔ جس کے نتیجے میں لا قانونیت کی فضا پیدا ہوتی ہے اور مسلکی، معاشی، مذہبی اور جنسی استحصال کے رستے ہموار ہوتے ہیں۔ رشوت ستانی اور قانون شکنی کے سبب اخلاقی اقدار کا انحطاط جنم لیتا ہے۔ حکومت صرف امراء کے اقتدار اور شان وشوکت کے لیے قائم نہیں ہوتی نلکہ ہر اعتبار سے سماج کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس ذمہ داری کو ہر حکومت تسلیم کرتی ہے لیکن اس پر عمل درآمد نہیں کرتی۔ محمد الیاس اس عمل داری کے نہ ہونے اور اقتدار کو محض اپنے فائدئے تک محدود رکھنے کی کلی کھول دیتے ہیں جو ان کے گہرے سماجی شعور کا عکاس ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس ناول میں جن جن عصرے مسائل کو موضوع بنایا گیا ان کے محرکات اوران کی اخلاقی حیثیت کے تعین میں محمد الیاس جس سماجی شعور کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ اسی سماج کی تشکیلی بنیادوں سے جنم لیتا ہے۔ مذہب پاکستانی سماج کا بنیادی عنصر ہے۔ عمومی طور پر مذہبی شدت پسندی کی پیشکش میں اس پہلو کو اتنا اجاگر کیا جاتا ہے کہ مذہب بذاتِ خود ایک سماجی خرابی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ جیسے مذہب کو ترک کر کے سماج کو شدت پسندی اور استحصال سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ لیکن محمد الیاس کے ناول "کُہر" میں صورتحال اس سے قطعی مختلف ہے۔ وہ مذہب کی مثبت عملداری اور اس کے سماجی ثمرات سے بخوبی واقف ہیں۔ لہذا وہ شدت پسندی اوراستحصال کے مقابل بر سرِپیکار مثبت مذہبی قوتوں کو

دکھاتے ہیں۔ یہ ان کی سماجی بصیرت ہے کہ اس خطے میں مذہب لوگوں کی زندگیوں میں جس حد تک داخل ہے وہ اس کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اس قوت کے ہی مثبت استعمال کی ترویج اور اس کے نام پر تخریب کو روکنا محمد الیاس کا مذہبی حوالے سے نکتہ نظر ہے۔

اسی طرح سماج میں پیدا ہونے والی سماجی اور اخلاقی برائیاں جو اخلاقی زوال کو سبب بنتی ہیں محمد الیاس کے ناول میں موجود ہیں۔ یہ برئیاں صرف فرداً معتوب کردار بن کر سامنے نہیں آتیں بلکہ اپنے تمام محرکات اور پسِ منظر کے ساتھ ابھرتی ہیں۔ اس پیشکش میں سماجی برائیوں کے پیچھے کارفرما عناصر کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ اخلاقی انحطاط سے معاشرے کو نجات دلانے کے لیے اس کے علل واسباب کا قلع قمع کرنا اور ان کی نقاب کشائی اس ناول کا مرکزی نکتہ ہے۔ جو پھیل کر فرد کی ذاتی اور داخلی زندگی سے لے کر ایک بڑے سیاسی کینوس تک چلا جاتا ہے۔ اس ناول میں ان عصری مسائل کی پیشکش اپنی حقیقی صورت میں موجود ہے۔ اس کے ذریعے تمانمایاں سماجی خرابیاں ہمارے سامنے اس طرح آتی ہے کہ وہ اس خطے کے فکری، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور دیگر تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ مصنف اپنے تمام عصری مسائل سے آگاہ اور ان کی تفہیم و تنقید کو مکمل سماجی شعور کے ساتھ پیشکش کتنے پر قادر ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد الیاس، کُہر، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۳

۲۔ ایضاً، ص ۱۵

۳۔ ایضاً، ص ۴۷ تا ۴۸

۴۔ ایضاً، ص ۴۰

۵۔ ایضاً ۳۹

۶۔ ایضاً، ص ۳۹

۷۔ ایضاً، ص ۴۰

۸۔ ایضاً، ص ۳۸

۹۔ ایضاً، ص ۴۷ تا ۴۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۹۶

۱۲۔ جمیل حیات، ڈاکٹر، کُہر: جمال پرستوں کے اُجڑے خوابوں کی داستان، مشمولہ: تسطیر ۴، جہلم، ص ۴۷۵

۱۳۔ محمد الیاس، کُہر، ص ۲۱۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۳ تا ۱۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۸۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۸۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۷۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۷۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۱۵ تا ۵۱۶

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۶۱

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۵۴

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۵۴

۲۵۔ القلم، آیت ۴، سورۃ ۲۸

۲۶۔ محمد الیاس، کُہر، ص ۲۵۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۵۲۰

۲۹۔ جمیل حیات، ڈاکٹر، کُہر: جمال پرستوں کے اُجڑے خوابوں کی داستان، مشمولہ: تسطیر ۴، جہلم، ص ۴۹۶

۳۰۔ محمد الیاس، کُہر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷، ص

۳۱۔ بازغہ قندیل، اردو ناول میں زوالِ فطرتِ انسانی کی تمثیلات، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۷

۳۲۔ محمد الیاس، کُہر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷، ص

۳۳۔ محمد الیاس، کُہر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷، ص ۵۴۵

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۹۰

۳۵۔ ایضاً، ص ۵۶۰

۳۶۔ منشایاد، کُہر پر ایک نظر، مشمولہ: سہ ماہی آبشار، ناول صدی نمبر، میانوالی، ۲۰۱۶، ص ۱۰۸

۳۷۔ محمد الیاس، کُہر، ص ۴۹۶

باب سوم

"حبس" میں سماجی شعور اور عصری مسائل

ناول کا تعارف

"حبس" محمد الیاس کے اب تک شائع ہونے والے ناولوں میں آخری ناول ہے۔ یہ ناول ۲۰۱۸ء میں سنگِ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوا" حبس" حالیہ تاریخ کے گزشتہ چالیس پچاس سالوں کی تاریخ کو سمیٹتا نظر آتا ہے۔ اس میں پاکستانی معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور خدوخال کو نمایاں کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ جیسا کہ ناول کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے۔ "حبس" ایک ایسے معاشرے اور سماج کا استعارہ بن جاتا ہے جہاں پر گھٹن کا راج ہے۔ دراصل اس ناول میں ایک ایسے سماج کی عکاسی کی گئی ہے۔ جس میں جبر کا دور دورہ ہے۔ نیز ادبی پیرایئے میں اس کے معاشرتی مسائل بھی بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں پر رکاوٹیں حد سے زیادہ لگائی گئی ہیں۔ یہاں پر تقریباً معاشرے کے ہر طبقے کو کامل آزادی میسر نہیں ہے، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان تعزیرات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس ناول کی بُنت پیپلز پارٹی کے ابتدائی ادوار سے لے کر اکیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی کے ابتدائی سالوں پر محیط ہے۔

عیسوی کی دوسری دہائی کے ابتدائی سالوں پر محیط ہے۔ نصف صدی یا اس سے کچھ زائد برسوں کی داستان ناول کی زبان میں بیان کر دی گئی ہے۔ آئندہ کسی دور کا اگر پاکستانی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو اسے " حبس" سے بہت مدد میسر آئے گی۔

"حبس" کا موضوعی جائزہ

"حبس "کا پلاٹ بڑا گٹا ہوا ہے اور ایک نئی ترکیب سازی کے ذریعے اس کی بُنت کی گئی ہے۔ اگرچہ تخلیق کار صیغہ واحد متکلم استعمال کرتا ہے جو کبھی ماضی اور کبھی حال کے انداز میں رواں دواں رہتا ہے۔ ناول کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے کہ سُسر اپنی یاداشتیں اپنے کمرے میں محفوظ کرتا جاتا ہے۔ اس کے خیال میں یہ محض کتھارسس ہے۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی سُود مند کام نہیں۔ شام کو سُسر جو بنیادی طور پر اس ناول کا ہیرو بھی ہے۔ جو بہت سا وقت باہر واک کرنے میں گزارتا ہے۔ جب گھر سے روانہ ہو جاتا ہے تو اس کی نئی نویلی بہو " نوشین" کی کسی طرح سے نظر ان تحریروں پر پڑ جاتی ہے۔ وہ ان کا مطالعہ چھپ چھپ کر کرنے لگتی ہے، اور

وہ اس کا ذکر اپنی یونیورسٹی کے ڈین اور ایچ اوڈی سے کرتی ہے۔ وہ مشورہ دیتی ہیں کہ نوشین ان اوراق کی فوٹو کاپی کروالے ایک اپنے پاس رکھ لے اور ایک ان کو بھجوادے۔ فوٹو سٹیٹ کروانے کے لیے انہی کا ملازم اگلے دن اس وقت آجاتا ہے۔ جب نوشین کا سُسسر دلدار عالم واک پر نکل جاتا ہے۔ اس کے واپس آنے سے پہلے ملازم ان تمام اوراق کی فوٹو کاپی کرواکے واپس بھی آجاتا ہے۔ اس کے بعد نوشین وہ اوراق پڑھنے لگتی ہے۔ ناول کی زبان صغیہ واحد متکلم میں بدل جاتی ہے۔ یہیں سے اصل کہانی کا آغاز ہوتا ہے جو ناول کے ہیرو کے متنوع تجربات ومشاہدات پر مشتمل ہوتی ہے۔ کہانی مختلف موڑ موڑتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کے ساتھ ساتھ تخلیق کار اپنا مطمئہ نظر بھی بیان کرتا ہے۔

محمد الیاس ناول میں ایسی زندگی سے متعارف کرواتا ہے۔ جس کا آغاز کالج کی زندگی سے ہوتا ہے۔ ناول کا ہیرو دلدار عالم ہے جبکہ وجی شاہ، مائیکل اور اظہر اس کے دوست ہیں۔ ان دوستوں کے ذریعے کالج کی سرگرمیوں کا عکس نظر آتا ہے۔ اسی طرح چند اوباش لڑکے بھی اسی کالج میں پڑھنے سے زیادہ غُل غبارہ مچانے میں مگن ہوتے ہیں۔ جنھوں نے شریف طلبا کی ناک میں دم کر رکھا ہوتا ہے۔ بلآخر وجی شاہ اس کا دوست مائیکل ان کی مشترکہ دوست جو کالج کی طالبہ نہیں ہے "نعمتے" مل کر اپنے انداز میں شریف طلبا کو چھٹی کا دودھ یاد کروادیتے ہیں۔ اس کے بعد شریف طلبا اس قابل ہی نہیں رہتے کہ دوبارہ کالج کے طلبا کا سامنا کر سکیں۔

دلدار عالم اپنے دوستوں میں سب سے زیادہ حسین اور وجیہہ صورت ہے۔ اس پر لڑکیاں ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں مگر وہ کسی چال میں نہیں پھنستا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کی شرافت یا شرمیلا پن نہیں۔ بلاشبہ یہ بھی اس کی ذات کا حصہ ہیں۔ مگر اصل وجہ "ثریا" ہے۔ جس علاقے میں فخر عالم جس کا بیٹا دلدار عالم ہے۔ وہیں وجی شاہ کا خاندان رہائش پزیر ہوتا ہے۔ وہاں پر ایک ضلعدار بھی آکر رہنے لگ جاتا ہے۔ "ثریا" اس کی بیٹی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ثریا اور دلدار عالم آتے جاتے محض آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتے ہیں۔ کبھی بھی ان کی آپس میں گفتگو نہیں ہو پاتی، جبکہ دونوں ایک دوسرے پر دل وجان سے فدا ہو چکے ہیں۔ اسی زمانے میں ثریا کا والد ضلعدار رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے۔ اس کی عزت اور ساکھ دونوں مٹی میں مل جاتے ہیں۔ اس کی ملازمت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ اسے شہر چھوڑ کر اپنے گاؤں منتقل ہونا پڑتا ہے۔ سزا بھگتنے کے بعد وہ وہیں پر اپنا کاروبار شروع کر لیتا ہے۔ دلدار عالم اور ثریا دونوں ایک دوسرے سے بہت دور چلے گئے۔

نواب خان ایس ایچ او کی بیٹی مقصودہ بی بی عرف سھودی ناول کا اہم کردار ہے۔ نواب خان دلدار عالم کے والد فخر عالم کا قریبی عزیز ہوتا ہے۔ ان دونوں کی آپس میں مسلسل ان بن رہتی ہے۔ دلدار عالم کا والد فخر عالم نہایت ایمان دار اور راست باز شخص ہے۔ دوسری طرف نواب خان کا کردار اس کے برعکس ہے۔ فخر عالم کا کردار پاکیزہ، بے داغ اور مضبوط ہے۔ نیز خدا ترسی اس کی ذات کا حصہ ہے۔ نواب خان کا کردار ان اوصاف سے عاری ہے۔ یہ ہی وجہ ہے ان دونوں کے تعلقات آپس میں صحیح نہیں ہیں۔ رزقِ حرام اپنے جلوے دکھاتا ہے۔ نواب خان کی بیٹی سھودی نوجوانی کے آغاز سے ہی بدکردار بن جاتی ہے۔ نواب خان کا بیٹا مقصود احمد عرف سھودا نیم پاگل ہو جاتا ہے۔ سھودی دلدار عالم کو حد سے زیادہ پسند کرنے لگتی ہے۔ اس کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ اسے دلدار عالم اپنا بنالے لیکن ایک تو سھودی کا کردار نہیں ہوتا اور دوسرا دلدار عالم ثریا کے نینوں کے سحر میں مبتلا ہو چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ سھودی ہزار کوشش کے باوجود اسے بہلا پھسلا نہیں پاتی اور سوچتی ہے کہ اس کی وجہ ثریا ہے۔ جب ثریا یہاں تھی تب اس نے کئی طرح کے ٹونے ٹوٹکے ضلعدار خاندان پر آزمائے تھے۔ اسی اثنا میں دلدار عالم ایک جگہ ملازمت کرنا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی پڑھائی کو بھی ساتھ ساتھ جاری رکھتا ہے۔

اپنی ایمان داری اور کمال دیانت داری سے ملازمت کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن بدقسمتی یہاں اس کے آڑے آتی ہے۔ جس فیکٹری میں وہ کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے مالکوں کے درمیان چپقلش کے نتیجے میں اسے ملازمت سے برخاست کر دیا جاتا ہے۔ ایسے میں فخر عالم کا پریس بھی نقصان میں جا چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ دلدار عالم کے لیے ملازمت کرنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے والد کے دوست کے ہاں کراچی چلا جاتا ہے۔ وہ اس کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں۔ ان کی ایک بیٹی ریحانہ اور دو بیٹے ہیں۔ جب دلدار عالم ملازمت کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ تب والد کا وہ دوست اسے بتاتا ہے کہ وہ دلدار عالم کو اپنے پاس ملازم رکھ لے گا تاکہ وہ مختلف امور سرانجام دے سکے۔ ایسے امور جو اس کے بیٹے سرانجام دینے سے قاصر ہیں وہاں پر رہتے ہوئے چند مہینے کے اندر اندر دلدار عالم اپنا اعتماد قائم کر لیتا ہے۔ ریحانہ ایک میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ صوم وصلوۃ کی پابند، نیک اور لڑکی ہوتی ہے۔

کچھ عرصہ بعد باپ بیٹی "راہوالی" اپنے خاندان کو ملنے کے لئے آتے ہیں۔ دراصل ریحانہ کی والدہ اپنے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ اپنے شوہر سے دور راہوالی میں رہتی ہے۔ جہاں پر وہ ایک مذہبی تنظیم کو چلاتی ہے۔ جس کے کارکن سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ خاتون مذہب کو حد درجہ تنگ نظر بنا دیتی ہے

مذہبی عقائد کو توڑ موڑ کر متشدد نظریے میں بدل لیتی ہے۔ اسی وجہ سے شوہر اس سے دور کراچی میں رہتا ہے۔ تاہم یہ بات ضرور ہے کہ ریحانہ اپنی ماں کے زیرِ تربیت رہ کر ماں جیسے خیالات کی حامل ہو جاتی ہے۔ اگرچہ وہ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔ لیکن اس پر ماں کی تعلیمات کا اثر چوکھا رنگ دکھاتا ہے۔ رہوالی میں رہ کر یہ باپ بیٹی دلدار عالم کے گھر پہنچتے ہیں اور دلدار عالم کے ماں باپ کو اپنے ساتھ کراچی لے آتے ہیں۔ دلدار کی والدہ اور ریحانہ میں حد درجہ ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جبکہ ریحانہ کا والد فخر عالم سے بات کر چکا ہوتا ہے کہ وہ آپس میں سمدھی بن جائیں۔

ریحانہ خود بھی دلدار عالم کو پسند کرنے لگتی ہے۔ اس نے کئی دفعہ دلدار عالم کو انتہائی مختصر لباس میں ورزش کرتے ہوئے دیکھا ہوتا ہے۔ بالآخر باپ فخر عالم سے اس رشتے کی بابت رائے مانگتا ہے۔ یوں دلدار عالم کا نکاح ریحانہ سے کر دیا جاتا ہے۔ ریحانہ کے میڈیکل کالج میں کچھ ایسی دوستیں بن جاتی ہیں۔ جو اپنے طرح طرح کے معشقوں کا ذکر کرتی ہیں اور اسے بھی اس راہ پر چلنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ ریحانہ اس ترغیب سے بچنے کے لئے اپنے شوہر دلدار سے زبردستی ازدواجی تعلقات قائم کر لیتی ہے۔ ایک دن وہ اپنے شوہر کو یہ خبر بھی سناتی ہے کہ اس کی ماں حاملہ ہے اور ممکن ہے وہ جلد ماں بن جائے۔ اسی اثناء میں ایک دن اچانک خبر ملتی ہے کہ فخر عالم کی وفات ہو گئی ہے۔ دراصل فخر عالم اپنی بیوی کے ساتھ واک کر رہا تھا۔ جب سھو دانے پاگل پن کی کیفیات کے زیر اثر سائیکل چلاتے ہوئے فخر عالم پر چڑھا دی۔ بدقسمتی سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ دلدار عالم جب گھر پہنچتا ہے تو اسے باپ کی موت کی خبر ملتی ہے۔ جب کہ دوسری طرف دو جڑواں بھائیوں کے پیدائش کی اطلاع بھی مل جاتی ہے۔ کچھ دن وہ وہیں رہتا ہے جب ایک دن پتہ چلتا ہے کہ ماں کو دل کا دورہ پڑا اور وہ بھی راہی ملک عدم ہو گی۔

بھائیوں کی ذمہ داری اگرچہ اس پر آن پڑی لیکن ایک پھوپھا اور پھوپھی جو انہی کے ہاں رہا کرتے تھے اپنی بیٹیوں کے فرائض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ انھوں نے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اسی دوران کراچی سے خط آتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ اس کے سسر کا کاروبار جو کسی دھوکہ باز کی وجہ سے پہلے ہی تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ تقریباً ختم ہو گیا۔ سُسر اس دکھ کو برداشت نہ کر پائے اور دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ افتاد پر افتاد آن پڑی تھی اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ یہ کہ سھو دی کا والد نواب خان بطور ایس ایچ او شہر تعنیات ہو گیا تھا۔ اس نے محبت اور دھمکی دونوں طرح سے دلدار عالم کو اپنی بیٹی سے شادی کرنے پر راضی کر لیا۔ بصورتِ دیگر وہ ٹکڑا جس پر ان کا گھر تھا۔ نواب خان چھین لے گا۔ دلدار عالم نے اپنی بیوی اور باقی خاندان کو اطلاع دیئے بغیر

اپنے بھائیوں کے مستقبل اور گھر کی خاطر مقصودہ بی بی سے شادی کر لی۔ مقصودہ بی بی سے شادی کے نتیجے میں اسے کثیر دولت مل گئی۔ خود مقصودہ بی بی نے ہزاروں روپے دیئے۔ جن کو کام میں لا کر وہ کراچی پہنچا۔ ریحانہ کی ادھوری تعلیم کو مکمل کرنے کا بندوبست کیا۔ اپنے برادران نسبتی کو ڈھیر ساری رقم دے کر ان کا کاروبار سیٹ کروایا۔ خود اپنے والد کے ایک دوست کی سفارش پر اسلام آباد سیکرٹریٹ میں بطور کلرک بھرتی ہو گیا۔ وہ دن بھر ملازمت کرتا شام کو راولپنڈی کے ٹرانزٹ کیمپ کے ایک کمرے میں وجی شاہ اور چند دوستوں اور چند دیگر دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں ہانکتا۔ یہاں پر اسے ایک اور دوست پراچہ مل گیا۔ پراچہ آزاد خیال مذہب بیزار اور شادی بیاہ کی جھمیلوں سے متنفر شخص تھا۔ پراچہ اگرچہ مذہب بیزار تھا لیکن کبھی کبھی ایسے لگتا وہ مذہب کی اصل حقیقت سے روشناس تھا۔ راولپنڈی میں رہتے ہوئے دلدار عالم کا واسطہ تین عورتوں سے پڑا۔ ایک خاتون ہر وقت برقعے میں ملبوس مکمل باپردہ نظر آتی۔ جب بھی دلدار نے اسے دیکھا نظریں جھکا کر گزرا لیکن حقیقت اس وقت کھلی جب یہ خاتون اسے اپنے گھر بلواتی ہے۔ ایک آدھ دفعہ خود اس کے کوارٹر پہنچ جاتی ہے اور اسے بدکاری کی ترغیب دیتی ہے۔ اس کا شوہر امریکہ میں ہے۔ کچھ بچے باپ کے ساتھ امریکہ میں سکونت پزیر ہیں۔ جبکہ دو بچے اس خاتون کے ساتھ بھی رہے ہیں۔ اس خاتون نے بدکاری کی صورت میں دلدار عالم کو روپے پیسے اور امریکہ میں اپنے ساتھ لے جانے کا یقین بھی دلایا۔ لیکن یہاں ایک بار پھر ریحانہ کی آنکھوں کا جادو سر چڑھ کر بولا اور وہ اس بدکار عورت کے نرغے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک اور خاتون کستوری جان اس کی رہائشی کالونی میں رہتی تھی۔ یہ غیر شادی شدہ تھی۔ اس کے پاس دو بوڑھے آفیسر آیا کرتے تھے۔ اس نے بھی دلدار کو ترغیب دی لیکن وہ ایک بار پھر حسین نینوں کی خاطر بچ گیا۔ تاہم کستوری جان کے اس جواب نے اسے حیران کر دیا کہ اس کا باپ اور بھائی اس سے بدکاری کرواتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شادی کے بعد بھی زندگی کا یہی چلن ہو گا۔ ایک اور لڑکی کشور دلدار عالم کے افسر کی بیٹی ہے۔ یہ بہت ماڈرن ہوتی ہے اور وہ بھی کوشش کرتی ہے کہ دلدار عالم کو اپنا بنالے۔ بعد ازاں اس کی شادی ایک پٹھان عمروزیرستانی سے ہو جاتی ہے۔ جو پہلے سے شادی شدہ ہوتا ہے

دوسری طرف ریحانہ نے ماں بننے کا یک طرفہ فیصلہ کر کے اس وقت دلدار عالم کو آگاہ کیا۔ جب دو ماہ کی حاملہ تھی۔ بہت پہلے ہی مقصودہ بی بی نے ذاتی خواہش پر دلدار عالم سے نہ صرف طلاق لے لی تھی۔ بلکہ آپریشن بھی کروالیا تاکہ ماں نہ بن سکے۔ جہاں جڑواں شہروں میں رہتے ہوئے دلدار عالم نے دونوں بھائیوں کے کاروبار سیٹ کئے۔ سھودی نے کاروبار میں اس کی مدد کی۔ یہ بڑی بزنس مین بن گئی تاہم دونوں کی ملاقاتیں

جارہی تھیں۔ دلدار اور سھودی بہت اچھے دوست تھے۔ سھودی نے ایک بہت بڑا فارم ہاؤس بنایا۔ جہاں پر بے آسرا بچوں، خواتین اور بڑوں کو آسرا فراہم کیا۔ بدنام سھودی خوش نام ہو گی۔ پورا شہر اس کے لئے دعائیں کرنے لگا۔ نواب خان ایس ایچ او ریٹائرمنٹ کے بعد توبہ تائب ہوا۔ حج کر آیا داڑھی رکھ لی اور مکمل بدل گیا۔ دلدار عالم گریڈ بیس میں بطور ڈائریکٹر ریٹائر ہوا۔ وجی شاہ گریڈ اکیس میں فارن سروس سے ریٹائر ہوا۔ ریٹائر ہو کر مذہبی زندگی اختیار کرتے ہوئے تبلیغ دین کے لئے نکل گیا۔ پر اچہ انتہا پسند مذہبی تنظیم کے ہاتھوں قتل ہوا۔ جس کا سوائے دلدار عالم کے کسی کو دکھ نہ تھا۔ دلدار عالم کی گھریلو زندگی کچھ زیادہ خوش کن نہیں تھی۔ وہ ایک شریف النفس مگر ریحانہ کے بجائے ثریا کا عاشق انسان تھا۔ اس نے اپنا یہ عشق آخری وقت تک نبھایا۔ وہ ایک آزاد خیال شخص ہوتے ہوئے حبس زدہ اور گھٹن سے ماری ہوئی زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ جبکہ اس کی شریک حیات ریحانہ جس نے مذہب کی غلط تفہیم کرتے ہوئے نیز ماں کی تعلیمات کے زیر اثر میڈیکل کی تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی۔

ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ دونوں مختلف سیاروں کی مخلوقات تھیں۔ ریحانہ نے کبھی بھی اپنے شوہر کو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور ہمیشہ اسے ایک فاسق وفاجر اور گنہگار انسان سمجھتی رہی۔ اس نے اپنے شوہر سے جسمانی علیحدگی اختیار کر لی۔ نیز بچوں کے نام بھی اپنی مرضی سے رکھے۔ یہی نہیں بہوئیں بھی اپنی پسند کی ڈھونڈیں ۔ صرف آخری اولاد عثمان کے لیے جیسی حد تک دھوکہ کھا گئی۔ عثمان نوشین سے پیار کرتا تھا۔ جو اس کی یونیورسٹی فیلو تھی۔ یہی نہیں کشور کی بیٹی بھی ریحانہ کسی لبرل لڑکی کو بہو بنانے پر راضی نہیں تھی۔ اس لیے دلدار عالم، کشور، نوشین اور عثمان نے مذہبی ڈھونگ رچایا اور نوشین ریحانہ اور دلدار کی بہو بن گئی۔

ایک دفعہ دلدار عالم گھر کی گھٹن سے تنگ آکر سھودی کے پاس چلا گیا۔ اس کے پاس دو دن رہا۔ کیوں کہ وہ اس کی بہترین دوست مونس و غمخوار تھی۔ اس نے نہ صرف اپنے محبوب کی محبوب ثریا سے ملاقات کر لی بلکہ اس کا نمبر بھی لے لیا جو بعد میں دلدار عالم کو دیا، دلدار عالم گھر واپس آنے کے بعد لاہور چلا گیا۔ اس کا ثریا سے رابطہ ہو گیا۔ دہائیوں بعد اپنی محبوب کے دیدار کی خواہش کو دل میں بسائے وہ لاہور پہنچا۔ ثریا کو دیکھا۔ ان دونوں کے نین ملے۔ اس دوران ثریا دلدار عالم کو بستر پر لیٹا کر چلی گئی۔ دلدار عالم اس بستر پر پورے گیارہ گھنٹے سوتا رہا۔ بیدار ہونے پر اسے ایک میسج موصول ہوا کہ میں شروع دن سے خواجہ سرا ہوں۔ میرے ماں باپ نے اس راز کو ہمیشہ رازر کھا لیکن میں دل وجان سے آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اس نے اپنی دو آنکھوں کی تصویریں بھی لے کر بھیجیں۔ دلدار عالم خوشی خوشی گھر لوٹ آیا۔ وہاں وہی روٹین جاری تھی۔ فرق بس اتنا

تھا کہ نوشین اپنے شوہر عثمان کے ساتھ کراچی سے واپس گھر آئی ہوئی تھی۔ کشور بھی وہیں موجود تھی۔ دلدار عالم سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑا اور راہی ملکِ عدم ہوا۔ دوسرے تیسرے دن نوشین دلدار عالم کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا، اس کے موبائل پر ثریا کی بھابھی کا میسج آیا تھا کہ ثریا نے جان جان آفرین کے حوالے کر دی۔ نوشین نے وقت کا اندازہ لگایا تو پتا چلا کہ دلدار اور ثریا کی موت کا وقت ایک ہی تھا۔ اس کے ساتھ ناول اختتام کو پہنچتا ہے۔ اس ناول کا دورانیہ بہر حال قابلِ غور ہے جو بھٹو دور سے لے کر اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے نصف اول پر محیط ہے۔

الف۔ مذہبی افکار کی عمل داری اور سماج پر اثرات

"کُہر" کے برعکس "حبس" میں خارجی عناصر سے زیادہ داخلی حوالے زیر بحث ہیں۔ مختلف سماجی بندشوں اور مذہبی پابندیوں کے زیر اثر فرد کے اندر جنم لینے والی کشمکش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی برائیاں "حبس" کا زیادہ موضوع رہی ہیں۔ ذیل میں مذہبی افکار کے پیشِ نظر معاشرے کی "حبس" میں بیان کردہ صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں۔

"حبس" کی کہانی ایک ایسے سماج کی کہانی ہے جہاں پر گھٹن کا راج ہے۔ یہ کہانی کمال سُبک رفتاری سے آگے بڑھتی ہے۔ کہانی کی بُنت اس احسن انداز میں کی گئی ہے کہ ہمارے سامنے ایک ایسے معاشرے کی تصویر آتی ہے۔ جہاں ہر طبقہ چھوٹے، بڑے بوڑھے، جوان، مرد اور عورت سبھی آزادی سے بیگانے معاشرے میں سانس لینے پر مجبور ہیں۔ جہاں پر آزادی اِظہار ہے ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو برائے نام۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس ناول کو پڑھنے کے بعد قاری خود ایسی گھٹن کا شکار ہوتا ہے کہ جس میں وہ اس سے فرار کی صورت تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے تو غلط نہ ہو گا۔

پاکستانی سماج کہنے کو تو ایک مذہبی سماج ہے اور کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہے، لیکن جب باریک بینی سے تجزیہ کیا جائے تو صورتحال اس بیانیے سے یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ یہاں مذہب کا نام تو بہت لیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں پاکستان میں برصغیر کے دیگر معاشروں کی مانند مذہب کے نام پر شبانہ رُوز استحصال جاری ہے اور بڑے فخر سے اس کو اسلام کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سماج کے اندر وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو برصغیر کے دیگر سماجوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔ محمد الیاس نے ان تمام

برائیوں کو بے کم وکاست بیان کیا ہے۔ انھوں نے مذہبی تضادات اور دکھلاوے کو قربانی کے تناظر میں بیان کیا ہے۔ مذہبِ اسلام میں قربانی کرنا سنتِ ابرہیمی اور ایک اہم مذہبی فریضہ ہے لیکن موجودہ دور میں یہ محض ایک دکھلاوہ بن کر رہ گئی ہے۔

> "شیخ ہاؤس کے آگے بندھا کٹے کی جسامت کا کالا نایاب دُنبہ لوگوں کا مرکزِ نگاہ بنا ہوا ہے آنے والی عید قربان کے لیے پالا گیا بے حد فربہ دنبہ واقعی دیکھنے کے لائق ہے۔ قربانی کی فضلیت کا صحیح ادراک رکھنے والے بعض معززین بھی شیخ ہاؤس آئے۔ ان کی خاطر مدارات ہوئیں اور تفصیلاً بتایا گیا کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے دنبے کو اعلیٰ سے اعلیٰ خوراک کھلائی جاتی ہے اور اولاد کے مقابلے میں زیادہ شوق و محبت سے پرورش کی جارہی ہے۔ ایسا بتاتے ہوئے شیخ صاحب کا فخر سے تن جانا بجا لگتا۔ دُنبے کے تنومند جثے کے علاوہ غیر معمولی پُھولی ہوئی چکی دیکھ کر ہول اٹھنے لگتا ہے کہ ہائیڈرالک پریس کے ذریعے اس میں ٹھونس ٹھونس کر بھری گئی چربی اپنے ہی دباؤ سے سیاہ چمکیلی کھال کو پھاڑ کر نکلنے ہی والی ہے۔۔۔ مولوی اختر صاحب نے دُنبے کی خوبی اور مالک کی بخشش کروانے کے حوالے سے استعدادِ کار اور اہلیت پر عالمانہ رائے دیتے ہوئے گلی کے لوگوں کی موجودگی میں فرمایا تھا کہ یہی وہ جانور ہے جو قربان ہو کر مالک کو اپنی پیٹھ پر لادے دوڑتا ہوا پل صراط پار کر جائے گا۔"[1]

"حبس" کے اندر ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جس میں مذہبی تضادات موجود ہیں۔ معاشرے کے اندر برداشت، رواداری، اخوت اور بھائی چارے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے مذہب یا مسلک پر اس طرح گامزن رہیں کہ جس سے دیگر افرادِ معاشرہ کے مذاہب یا مسالک پر حرف نہ آئے۔ اسی حوالے سے ناول نگار بیان کرتے ہیں۔

> "لالچ بُری بلا ہے۔ انسان "کر بھلا ہو بھلا" کا سنہری اصول پیشِ نظر رکھے۔ ایک دوسرے کے کام آئے اس سے معاشرے میں رواداری کے جذبات فروغ پاتے ہیں۔"[2]

اس کے ساتھ ساتھ محمد الیاس نے مذہبی منافقت کو پراچہ اور مولوی نہال الدین کی گفتگو سے واضح کیا ہے۔ انھوں نے ان دو کرداروں کی گفتگو سے اس منافقت بھرے معاشرے کی وضاحت کی ہے۔

"پراچہ نے مولوی صاحب کا بڑھا ہوا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور کہا: "ایمان خراب نہیں کرتا،۔۔۔نہ جانے کب سے حوائج کو روکے بیٹھے ہیں ۔اور تو اور ہوا بھی روک رکھی ہو گی تا کہ وضو قائم رہے اور اسی سے نماز ہو جائے۔ ظاہر ہے، ٹھنڈے پانی سے استنجا اور وجو کونا آسان نہیں ہوتا۔ توپی کوٹ بُوٹ اُتارنا کوئی مذاق ہے! اور حوائج روکنا اپنی ذات پر خود اپنے ہاتھوں بے رحمانہ ظلم ہے۔۔۔اس غیر فطری جبر کے ساتھ تو ذہن کام ہی نہیں کرتا۔ کوئی ڈھنگ کی بات سوچی ہی نہیں جاسکتی۔ اسی لیے تو ہم بحیثیت قوم غبی ہیں۔"[۳]

محمد الیاس نے ناول میں بیشتر مسائل بیان کیے ہیں۔ جنھوں نے پاکستانی معاشرے کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے ناول کا بنیادی کردار ریحانہ اپنے تئیں دین کی درست تفہیم کر رہا ہے۔ اسی طرح ریحانہ کی والدہ بھی کسی علمی، مذہبی یا روحانی شخصیت سے تربیت لیے بغیر خود کو دین کا ٹھیکیدار سمجھنے لگتی ہے۔ ریحانہ کا والد اپنی بیوی کی انتہا پسندانہ سوچ کی وجہ سے اس سے دور اپنے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ راہوالی میں رہ رہا ہے اور مہینوں بعد بیوی بچوں کو ملنے جاتا ہے۔ ریحانہ کی والدہ ریحانہ کی شادی کے بعد اپنے داماد سے اس انداز سے پردہ کرتی ہے کہ دلدار عالم کا جی چاہتا ہے کہ وہ وہاں سے اٹھ کر چلا جائے۔

"ساس صاحبہ نے تمام تر شفقت اور خلوص کا اظہار چہرے پر نقاب ڈال کر کیا، گویا ان کے نزدیک امکانی طور پر داماد پر بھروسہ کرنا بھی خطرہ ایمان ثابت ہو سکتا تھا"۔[۴]

یہی نہیں بلکہ وہ اپنی بیٹیوں کو بھی دلدار عالم سے بات چیت کرنے پر سرزنش کرتی ہے۔

"دبی دبی آواز میں بیٹیوں کی سرزنش کرنے لگیں کہ وہ بدن کو چادروں سے ڈھانپنے کی بجائے باریک دوپٹہ سینے پر پھیلائے بہنوئی سے محوِ گفتگو تھیں ،جو کہ سراسر غیر شرعی فعل ہے۔"[۵]

دوسری طرف اپنی والدہ کی انتہا پسندانہ سوچ کی وجہ سے ریحانہ میڈیکل کی تعلیم ادھوری چھوڑ دیتی ہے۔ حالانکہ ڈگری کی تکمیل کے لئے چند مراحل درکار تھے۔ لیکن والدہ کی نصیحتوں کے پیشِ نظر اس نے تعلیم چھوڑ دی۔

"اماں مجھے شروع سے خط لکھ کر نصیحتیں کرتی رہی تھیں کہ عورت کی پہلی ترجیح اُس کا شوہر اور گھر ہونا چاہیے نہ کہ ایم بی بی ایس کی ڈگری۔۔۔بھائیوں کو بتا دیا کہ اماں کی ہدایت پر پڑھائی چھوڑ کر خاوند کے پاس جا رہی ہوں۔"[۶]

یہی نہیں بلکہ بچہ پیدا کرنے کے لیے اپنے شوہر کی رضامندی کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے۔ بچوں کے نام رکھنے، ان کی شادیاں کرنے تک کے مراحل کو اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔

"ایک بات بتانا بھول گئی کہ میں نے ناموں کا انتخاب کر رکھا ہے۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئیں گے۔ بیٹا ہوا تو عمر اور بیٹی ہوئی تو حفصہ رکھیں گے۔"[۷]

نیز شوہر سے جسمانی علیحدگی اختیار کر لیتی ہے کہ اس کا شوہر دیندار نہیں جبکہ شوہر کا احترام اور عزت کرنا ہر مذہب کے ہاں مسلمہ پابندی ہے۔ یہاں مذہبی اقدار کو چھوٹی چھوٹی خواہشات اور داخلی کیفیات کی آسودگی کے لیے موڑ توڑ لیا جاتا ہے اور کبھی کبھار اس سماجی دباؤ یا ضرورت کے تحت فرد کے اندر پیدا ہونے والے لالچ یا خوف اسے بہت سی ایسی چیزوں کو ماننے پر مجبور کر دیتا ہے جو توہم پرستی اور بے اعتقادی کی طرف لے جاتی ہیں۔

برصغیر میں توہم پرستی عام ہے۔ کسی بھی مذہب یا مسلک کے ماننے والے اس حد تک توہم پرست ہو جاتے ہیں کہ انھیں مذہب کی تعلیمات بھول جاتی ہیں۔ آج بھی لوگ ٹونوں ٹوٹکوں اور ایامِ باطلہ کی توہم پرستی پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ ناول میں اس حوالے سے تفصیلاً بیان کیا ہے۔

"ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ گزشتہ چار مہینوں سے چاند کی ہر پندرھویں تاریخ کو دریا کنارے کسی نابینا کی قبر پر دعا کے کیے جا رہے ہیں، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں اعتقاد اور مستقل مزاجی سے جانے والے بصارت سے محروم افراد ایک نہ ایک دن شفا پا لیتے ہیں"[۸]

انہی مزارات اور توہم پرستی کے حوالے سے مشہور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی "آبِ گم" میں لکھتے ہیں:

"مزار اگر خالی از میت ہے تو غنیمت جانیے، ورنہ اللہ جانے اندر کیا دفن ہے؟، جس کا اس دھوم سے عُرس منایا جا رہا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ کراچی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نہ دیکھتے ہوں کہ آج فلاں آستانہ عالیہ پر چادر چڑھائی جا رہی ہے۔ پانچ بجے گا گر شریف، جلوس کی شکل میں لے جائی جائے گی۔ پھر اس سے مزار شریف کو غسل دیا جائے گا۔ بعد نمازِ مغرب لنگر شریف تقسیم ہو گا۔ ہم نے بعض نو دریافت بزرگوں کے نو تعمیر مزاروں کے ضمن میں "شریف" پر تاکیداً اتنا زور دیکھا ہے کہ دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگتے ہیں۔ ہم نہ ضعیف الاعتقاد ہیں نہ وہابی، لیکن کراچی

کے ایک مزار کے بارے میں جو ہمارے سامنے پُر ہوا ہے، ہم بالاعلان یہ تسلیم کرنے
کے لیے تیار ہیں کہ اس سے متعلق ہر چیز شریف ہے۔ سوائے صاحب مزار کے "[۹]

لوگ جہالت، کم علمی، دینی شعار سے غفلت کے باعث اپنی مذہبی اقدار وروایات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اندھا دھند جعلی عاملوں مفاد پرست مجاوروں، بے عمل پیروں، نام نہاد فقیروں جادو ٹونے اور توہمات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ محمد الیاس اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"ضعیف الاعتقادی، توہم پرستی اور جہالت کے مظاہروں میں کمی آنے کے بجائے
اضافہ ہو رہا تھا۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور ہمارے لوگ اب بھی صدیوں پرانے
رسم ورواج کے غلام ہوئے چلے آرہے ہیں۔"[۱۰]

پاکستانی معاشرہ مسلم معاشرہ ہے۔ جس کی بنیاد ہی یقین اور تقویٰ پر ہے۔ جن کا عقیدہ ہی یہی ہے کہ اس کائنات کا خالق ومالک اللہ کی ذات ہے اور اس کی اجازت کے بغیر پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ خالق ہے اور اپنی مخلوق کا سوال کرنا، اسی سے امید لگانا اور پھر اسے بے حساب نوازنا بہت پسند ہے۔ لیکن عقیدہ توحید کا پیروکار ہونے کے باوجود لوگ توہم پرستی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس جہالت کا مرتکب ہو کہ لوگ اپنے عقائد سے روگردانی کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ برصغیر میں ہندو قوم کی طویل رفاقت کا اثر ہے۔ جنہوں نے دیویاں اور دیوتا بنا رکھے تھے۔ آج بھی ان اثرات سے ہمارا دامن نہیں بچ سکا۔ محمد الیاس نے انہی اثرات کو بیان کیا ہے۔ "حبس" میں ایک اور جگہ اسی توہم پرستی کو موضوع بناتے ہیں۔

"مولوی الف دین کی بیوی کو بڑا مال کھلایا ہے۔ وہ کپڑے کی گڈیاں بنا کر دیا کرتی اور
سویاں۔ ایک عمل بتایا جو رات کو سونے سے پہلے گُڑیا کے سینے میں تین سوئیاں کھبو کر
کرتی اور سو جاتی۔ تین بجے اٹھ کر گڑیا کو پگھلے ہوئے موم کی ڈبکی دے کر نکالتی اور
آگ لگا دیتی۔"[۱۱]

یہ محض اتفاق تھا کہ مولون کا تکا چل گیا تھا۔ جسے سھودی نے جادوٹونے کا اثر قرار دیا تھا۔ حالانکہ تصویر کا درست رخ یہ ہے کہ ضلعدار رشوت خور تھا۔ وہ اسی بڑائی کی وجہ سے گرفتار ہوا اور بالواسطہ ثریا اور دلدار عالم میں جدائی ہو گئی۔ سھودی اس حوالے سے دلدار عالم کو بتاتی ہے کہ

"میں نے بددعائیں کرنا شروع کیں، رات دن۔ اللہ سے کہتی؛ میرے مالک! ضلعدار
ہاؤس پر کوئی بڑی آفت نازل کر۔ جب بھی بارش کا سماں بندھتا، جھولی پھیلا کر بددعائیں

کرتی؛اے اللہ! آج بجلی گرادے اس گھر پر پلک جھپکنے میں راکھ ہو جائے۔ جادو ٹونے کئے۔"[۱۲]

برصغیر کے معاشرے میں جادوٹونے اور جھاڑ پھونک پر لوگوں کا اعتقاد بہت پُختہ ہے۔ محمد الیاس نے اسی توہم پرستی کو سھودی کی زبانی بیان کیاہے۔ اسی طرح سھودی بار بار یہ کہتی ہے کہ کاش اس نے جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکے کے ذریعے دلدار عالم اور ثریا کی جدائی نہ کروائی ہوتی۔ کاش جادو کے ذریعے ضلعدار کا گھر برباد نہ کیاہوتا۔ سھودی ندامت محسوس کرتے ہوئے کہتی ہے۔

"کسی کسی وقت بڑا ملال آتا ہے کہ میں نے جادوٹونے کروا کر خواہ مخواہ ضلعدار کو برباد کیا۔ اس کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔"[۱۳]

ہندوستانی معاشرے کا ایک المیہ پیری مریدی ہے۔ صدیوں کے ستم رسیدہ طبقوں کا عقیدہ ہے کہ پیر کی خوشنودی حاصل ہونے سے بگڑی سنور سکتی ہے۔ چاہے اس کے لیے قیمتی متاع عصمت ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑ جائے۔

"ایک مریدنی کی گود میں پھول سی ننھی بچی کو دیکھتے ہی میرا دھیان خود بخود اپنی ماں حضور کی طرف چلا جاتا ہے۔ نامراد مریدنی میری غیر موجودگی میں خوشی اور جوش سے پھول کر کُپا ہو جاتی ہے۔۔۔ پچھلی مرتبہ مجھے موقع مل گیا۔ اس کو بچی کا خیال رکھنے اور اچھی پرورش کرنے کی تاکید کی اور غفلت کی صورت میں اور بھی سخت وعید سنائی تو وہ لرز کر بولی توبہ استغفار شاہ جی! میں کوڑھی کافر ہو کر نہ مروں اگر سید زادی کی خدمت اور عزت میں فرق آجائے"[۱۴]

وہی جہالت، توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی عام ہے۔ جس کے مظاہرے معاشرے میں ساٹھ برس سے دیکھتے آرہے ہیں۔ گویا عام آدمی کا ذہنی ارتقا صدیوں سے رُکا ہوہے اور ستم بالائے ستم قوم مجموعی طور پر خبطِ عظمت میں مبتلا ہے۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے ان کے طور طریقے اپنانے شروع کیے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے معاشرے کے وہ افراد جنھیں مذہب کی تعلیمات سے آگاہی نہ تھی۔ انھوں نے توہم پرستانہ افعال پر یقین کرنا شروع کر دیا۔ جو آج بھی ہمارے معاشرے میں اسی شدومد سے جاری ہے۔ آج بھی لوگ مذہبی اقدار کو اس قدر کھوکھلا کر چکے ہیں کہ شر پسند عناصر ان کا فائدہ اٹھا کر ہمیں ہمارے لوگوں کے خلاف کر رہے ہیں اور ہم ان کے ہاتھوں کٹھ پُتلیاں بنے ان کے اشارہ ابرو پر رقص کناں ہیں۔ آج ہر کہیں

ساس اپنی بہو کے خلاف تعویذ گنڈے کروا رہی ہے تو کہیں بہو اپنی ساس کا ناطقہ بند کرنے کے لیے جعلی پیروں فقیروں اور عاملوں کی جیبیں گرم کر رہی ہے۔ بعض جذباتی نوجوانوں کو ایک تعویذ کے ساتھ سنگ دل محبوب آپ کے قدموں میں کالا لچ دیا جا رہا ہے تو کچھ لوگوں کو اولادِ نرینہ کے نام پر لُوٹا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ فکرِ معاش سے تنگ آ کر ان پیروں فقیروں اور عاملوں کے جعلی آستانوں کا رخ کر رہے ہیں۔ محمد الیاس نے اس ناول کے ذریعے برصغیر کے اندر برپا ہونے والی توہم پرستی اور سماجی مسائل کی داستانیں بیان کی ہیں۔

د۔ سماجی بندشیں اور طبقاتی تقسیم کے اثرات

کسی بھی ملک اور قوم کی تاریخ میں اس قدر بین طبقہ واری امتیاز، پیشوں اور زندگی کے مشغلوں کی اٹل تقسیم دیکھنے کو نہیں ملتی، جیسی ہندوستانی معاشرے میں ہے۔ یہ طبقاتی تفریق ویدک کے آخری زمانے سے شروع ہوئی۔ آریاؤں نے اس ملک میں اپنی فاتحانہ حیثیت برقرار رکھنے کے لیے طبقاتی اور نسلی امتیاز کو ضروری سمجھا۔ یہی تقسیم صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ آج بھی ہمارا معاشرہ اس کا شکار ہے۔ یہ ایک مثالی اور بے نظیر سماج نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا سماج ہے جو فرد کی آزادی اور آگے بڑھنے کے راستوں پر ہزار بندشیں لگاتا ہے۔ جن سے اوقات فرد سمجھوتا کر کے ان کا عادی ہو جاتا ہے۔ اسے زندگی بھر اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ بیسیوں بندشوں کا رزق ہو گیا ہے۔ اس کی ان گنت اور لاتعداد توانائیاں سلب ہو گئی ہیں۔ اسی طرح کچھ افرادِ معاشرہ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے راستے میں، اپنی آزادی کے آگے حائل ان بندشوں اور طبقاتی تقسیم کو بوجھ سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی تاب و توانائی کا تماشا ہوتے تو دیکھ سکتے ہیں لیکن وہ ان بندشوں اور طبقاتی تقسیم کے جال کو توڑنے کی ہمت نہیں کر پاتے۔ یوں یہ حد درجہ گھٹن اور حبس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بہت ہی چنیدہ لوگ ایسے ملیں گے جو اپنی الگ راہ پر چلنے کا راستہ تلاش کر لیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا سماج بالخصوص اور برصغیر کے سماج بالعموم تقسیم در تقسیم میں ایسے مبتلاء ہو گئے ہیں گویا یہ سماج مکڑی کا ایک جالا ہو اور فرد ایک مکھی، جس کے لیے راہِ فرار کہیں بھی نہیں ہے۔ اس سماج کو ایک ایسے سماج کی مانند قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کا سرا سرمایہ دار کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس پنجرے کے اندر قید ہے۔ پورا سماج اسی کمزور اور لاچار پرندے کی مانند ہے جس میں وہ پرندے اس پنجرے میں رہتے ہوئے اسی زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں، جبکہ کچھ اس کی آہنی سلاخوں سے سر پٹول کرتے ہیں مگر خود ہی زخمی ہو کر گر پڑتے ہیں۔ بہت ہی کمیاب ایسے پرندے ہوتے ہیں جو اس

پنجرے سے راہِ فرار پا لیں گے۔ پاکستانی سماج ایک ایسا سماج ہے جہاں پر مسلکی، لسانی، جغرافیائی، نسلی اور نامعلوم کون کون تقسیم ہو چکی ہے اور شاید ہمیں اس تقسیم سے بچنے کے لئے صدیاں درکار ہوں۔

تاہم جب محمد الیاس کے ناول "حبس" کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اپنے سماج کے اندر موجود بندشوں اور طبقاتی تقسیم کی سمجھ آجاتی ہے۔ ناول کو پڑھتے پڑھتے قاری آخر میں ایک ایسے نقطہ پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کا دم گھٹنے لگا ہے۔ "حبس" کے اندر ایک ہی کہانی چلتی ہے بلاشبہ یہ کہانی اپنی منتہا اور اختتام کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے لیکن در حقیقت یہ ایک حبس اور گھٹن کے مارے ہمارے سماج کی داستانِ حیات ہے۔

ناول کے آغاز ہی میں محمد الیاس سماج کی تصویر کشی میں معاشرے کے تمام طبقات کو اپنی الگ الگ شناختوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور پھر ایسی برائیوں کو ان کرداروں کے ذریعے اجاگر کرتے ہیں۔ جن کے پنپنے کا سبب وہ طبقاتی حوالہ ہے۔ یہ پیشکش اتنی بھرپور ہے کہ طبقاتی تقسیم کی اثر پذیری قاری بڑی آسانی سے محفوظ کر لیتا ہے۔ جیسا کہ ناول میں کئی ایک طبقات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اگرچہ کالج کے طلباء کی ایسی سرگرمیاں نظر آتی ہیں جن میں کھلنڈراپن موجود ہے، مگر ان میں کوئی مسلمان ہے، کوئی عیسائی ہے، کوئی طاقتور ہے، کوئی کمزور ہے، کوئی دولت مند ہے، کوئی غریب ہے، کہیں پر وجی شاہ ہے، جس کے اجداد پیری مریدی سے وابستہ رہے ہیں۔ آج بھی خواتین اسے اپنا پیرزادہ ہی نہیں سمجھتیں بلکہ اپنی قیمتی ترین متاع، اپنی عصمت کو اپنے پیرزادے پر وار کر خود کو خوش قسمت قرار دیتی ہیں، حالانکہ عام حالات میں ایسے افعال پر بلوا ہو جاتا ہے۔

محمد الیاس جہاں ایک طرف اس طبقاتی تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی برائیوں کی عکاسی کرتے ہیں، وہیں وہ ان طبقات میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور معاشی ناہمواری کو بھی بیان کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ عمومی طور پر ناول کی روانی میں ہی دو ایسے کرداروں کے سماجی پر مرتبے اور معاشی حالات کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر دیکھاتے ہیں۔ جس سے یہ معاشی تفاوت بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ جیسے دلدار عالم کا باپ مالدار طبقے کا نمائندہ ہے اور اس کا دوست جھونپڑیوں میں رہنے والا ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب دلدار عالم کا باپ ایک گوشت فروش دوست سے ملنے اس کی دعوت پر گاؤں جاتا ہے۔ میزبان عطا محمد کا گھر اتنا چھوٹا ہے کہ تمام گفتگو مہمان سن رہے ہوتے ہیں۔ مثال دیکھئے۔

> "کُھلے صحن میں مرغیوں کا ڈربہ تھا اور کمرے سے متصل چھپڑ نما رسوئی تھی، جہاں اہلِ خانہ کے مابین ہونے والی گفتگو ہم بخوبی سن رہے تھے۔۔۔ ہمیں بنٹے والی تین بوتلیں

کھلنے کے "ٹھس ٹھس" نما ہلکے دھماکے سنائی دیئے گئے۔ عطا محمد کہہ رہا تھا" کل رات سے اب تک کورے گھڑے کت ٹھنڈے پانی میں پڑی رہی ہیں۔ انشاء اللہ گزارے لائق ضرور ٹھنڈی ہوئی ہوں گی۔ اللہ سوہنا غریب کی لاج رکھنے والا ہے۔"[۱۵]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ میزبان کے گھر میں غربت اپنے پنجے گاڑھے ہوئے ہے۔ وہاں پر مکھیاں ہی مکھیاں ہیں اور میزبان کے بیٹے نظیر اور بشیر دیوار کے پیچھے بیٹھ کر اس انتظار میں ہیں کہ مہمان پیش کئے گئے جوس میں سے کچھ دیں گے تو وہ بھی پہلی دفعہ اس جوس کا ذائقہ چکھ لیں گے۔

" دودھ میں بوتل ملانے سے جو چیز بنتی ہے اس کا مزہ کیسا ہوتا ہے؟۔۔۔ دوسرے نے جواب دیا مجھے کیا پتا؟ میں نے کوئی پی ہے کبھی؟۔۔۔ ذرا توقف کرتے ہوئے کہنے لگا دُعا کرو، مہمان تھوڑا سا بچا دیں تا کہ ہم بھی سواد چکھ لیں۔"[۱۶]

اسی طرح میزبان اپنی بہن کے گھر میں حلوہ اور کسی ایک اور گھر میں سویاں بنوانے کے لیے کہلا بھیجتا ہے لیکن وہ دونوں چیزیں جل جاتی ہیں۔ اچھی طرح سے تیار نہیں ہو پاتیں۔ اس نے پتا چلتا ہے کہ ان لوگوں کے ہاں میٹھا پکانے کی رسم کمیاب ہے۔ محمد الیاس نے اس معاشرتی اور طبقاتی تقسیم کی عمدہ عکاسی کی ہے کہ جہاں ایک طبقے کے ہاں مہمانوں کی آمد پر کھانے کے لوازمات سے میز سجادی جاتی ہے اور دوسری طرف میٹھے اور بوتل کے ذائقے سے ہی ایک طبقہ محروم ہے۔

ناول میں جاگیر دار معاشرے کی عکاسی بھی بڑی عمدگی کے ساتھ کی گئی ہے۔ جاگیر داروں کا مزارعوں اور عام لوگوں کے ساتھ جو ناروا سلوک رکھا جاتا ہے۔ اس کو محمد الیاس نے بیان کیا ہے۔ جیسا کہ عطا محمد کے بیٹے بشیر اور نذیر ملک برادری کے چوپال کے قریب سے گزرتے ہوئے ہر دفعہ زور سے سلام کرتے تھے۔ ایک دفعہ ملک صاحب نے بلا کر تھپڑ رسید کیے کہ ہر دفعہ سلام کہنے کی کیا ٹک بنتی ہے اور پھر اسی راستے سے گزرتے ہوئے سلام نہ کیا تو ملک صاحب نے بلا کر تھپڑ رسید کئے کہ سلام کیوں نہیں کرتے۔

"۔۔۔ یاد کرو وہ پچھلی سردیوں والی بات، جب ملکوں کے ڈیرے سے دو تین بار گزرتے ہوئے ان کے بیٹے کو تم نے اوپر تلے سلام کیا تو اُس نے قریب بلا کر تھپڑ مار دیا اور کہا بار بار سلام کیوں کرتے ہو؟ اور ہفتے بعد گلی سے گزرتے ہوئے جب اُس کو سلام کیے بغیر نکل گئے تو ہمیں روک لیا اور ایک ایک تھپڑ مار کر کیا کہا تھا؟۔ قصائی کی اولاد۔ بغیر سلام کیے ہی گزر رہے تھے۔ دماغ آسمان پر کس وجہ سے جا پہنچا ہے؟۔"[۱۷]

یہ دونوں بھائی ملک برادری کے بچوں سے دوستی کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی خواہش کو احترام نہ ملا اور وہ بچے ان دلدار عالم سے دوستی استوار کرنا چاہتے تھے۔

"ملکوں کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ ہم ان کی زمین پر رہ رہے ہیں۔ لیکن دلدار ضرور دوست بن جائے گا۔ اس کے باپ نے ہمارے باپ کو دوست بنالیا ہے۔ ورنہ ہر روز روٹی کیوں کھلاتا۔"[۱۸]

اگرچہ یہ محض ایک واقعہ ہے لیکن در حقیقت اس کے پسِ منظر میں طبقاتی تقسیم اور معاشرتی بندشوں کی کھلی کھل جاتی ہے۔

محمد الیاس نے سماج میں معاشرتی تفاوت اور طبقات کے درمیان اونچ نیچ اور ذات پات کے نظام کو بھی بیان کیا ہے۔ اس طبقاتی کشمکش کو وجی شاہ کے کردار سے واضح کیا ہے۔ وجی شاہ سادات خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ سادات سے تعلق ہونے کی وجہ سے معاشرے کے اندر اس کی توقیر بھی نظر آتی ہے۔ ایک دفعہ ایک پھیری والا وجی شاہ کو ملتا ہے تو کہتا ہے۔

"پیروں کا دیدار ہوا۔ میں نمانے کے ایسے بھاگ!! سارے دن کی تھکاوٹ اتر گئی۔"[۱۹]

وجی شاہ نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا مگر وہ نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا:

"سرکار! کیوں گہنگار کرتے ہیں۔ میں سید بادشاہ کے برابر بیٹھوں، کوڑھا ہو جاؤں؟"[۲۰]

یہ طبقاتی تقسیم کے بہت ہی ابتدائی نقوش ہیں۔ جُوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے۔ معاشرتی بندشوں اور طبقاتی تقسیم کی نئی سے نئی کڑی کھلتی چلی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک وقت میں دلدار عالم وجی شاہ اور اظہر بہت اچھے دوست ہوتے ہیں۔ بعد ازاں وجی شاہ اور دلدار عالم کلرک بن جاتے ہیں جبکہ اظہر پولیس آفیسر بن کر راولپنڈی میں تعینات ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں اپنے پرانے دوست اظہر سے ملنے اس کے دفتر جاتے ہیں۔ دلدار عالم اور وجی شاہ کے دلوں میں اپنے پرانے دوست سے ملنے کے لئے لیے بے قرار امنگیں موجود ہیں، لیکن اظہر انھیں پہلے ویٹنگ روم میں انتظار کرواتا ہے اور جب ان سے ملتا ہے تو گلے ملنے کے بجائے محض ہاتھ ملاتا ہے۔ جس سے دلدار عالم اور وجی شاہ کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ بہت جلد وہاں سے اُٹھ آتے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جب یہ دونوں دوست ڈی ایس پی آفیسر بن جاتے ہیں تو اظہر خود ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی طبقاتی تقسیم اور حقیقت ہے۔

پاکستانی معاشرے میں بیوروکریٹ خود کو خدا سمجھتے ہیں اور مخلوق خدا کو انسان بھی سمجھنے کو تیار نہیں اسی طرح ایک بیوروکریٹ کی بیٹی کشور شام کے وقت مغربی لباس پہنے شیفرڈ کو اپنے ساتھ لئے ایک سہیلی کے ہمراہ ہر روز واک کے لئے نکلتی ہے۔ اشرافیہ کے لئے خود کو دوسروں سے برتر قرار دینے کے لئے مغربی لباس اور کتے کی ہمرای آج بھی موجود ہے۔ "جس" کے اندر جگہ جگہ طبقاتی تقسیم موجود ہے۔

طبقاتی تقسیم کی ایک اور کڑی اس وقت ہمارے سامنے آتی ہے۔ جب آزاد خیال اور بائیں بازو سے وابستہ پراچہ کو ایک مذہبی جماعت قتل کروا دیتی ہے۔ ایک طرف تو دائیں بازو اور بائیں بازو میں تقسیم معاشرہ سامنے آتا ہے اور دوسری طرف دائیں بازو کا طاقتور ہونا اور انتہا پسندی کا اس پر جانا سامنے آتا ہے کہ وہ اپنے مخالف فکر رکھنے والے شخص کو قتل کروا دیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک سماج کے اندر پلنے والے مسائل ہیں۔ ایک ایسا سماج جس میں طبقاتی تقسیم اپنی انتہاؤں کو چھو رہی ہو۔ ایسا معاشرہ تقسیم در تقسیم کے عمل سے بار بار گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے وطنِ عزیز کو طبقاتی تقسیم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کے باوجود ملک کے ٹوٹ جانے کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو جانا دراصل طبقاتی تقسیم کا ایک بہت بڑا شاخسانہ تھا۔ جہاں پر لسانی تقسیم نے زیادہ اہم کردار ادا کیا۔ محمد الیاس کے ناول "حبس" کا مطالعہ کرنے سے طبقاتی تقسیم اور اس کے نتیجے میں ابھرنے والے مسائل بار بار سامنے آتے ہیں۔

محمد الیاس نے معاشی پریشانیوں کو بھی ناول میں موضوعِ بحث بنایا ہے۔ انھوں نے بے روزگاری اور اس سے پریشان حال طبقے کے لوگوں کی زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کے ساتھ پیدا ہونے والے مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔ ناول میں ایک نسوانی کردار مسرت کا ہے۔ جس کا شوہر امریکہ میں رہائش پذیر ہے۔ اس کی بیوی شوہر کی غیر موجودگی میں نسوانی خواہشات کی تکمیل کے لیے دلدار عالم کو بدکاری پر قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور کہتی ہے کہ تمھیں پولیس سے ڈرنے کی ضورت نہیں ہے۔ پولیس چھاپہ نہیں مارے گی۔

"ضرور جاؤ مگر چاچے کی فکر مت کرو۔ ادھر کنگلا لوگ تو نہیں کہ پولیس چاپا مارے"[۲۱]

یہ جملے طبقاتی تقسیم کو مزید واشگاف کرتے ہیں۔ پولیس بھی پسماندہ طبقات کا لہو نچوڑنے کے لیے متحد رہتی ہے جب کہ اشرافیہ کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ اس واقعے کو پاکستانی معاشرے کے اندر رہتے ہوئے دیکھا جائے تو اگر مرد معاشرے کے اندر مرد غربت کی چکی میں نہ پس رہا ہوتا تو وہ سات سمندر پار رزق کمانے کے لئے نہ جاتا اور یوں میاں بیوی کے رشتے میں بندھے دو افراد ایک دوسرے سے دور نہ ہوتے گویا یہ تمام باتیں معاشرتی تقسیم اور اس کے نتیجے میں ابھرنے والے مسائل کا شاخسانہ ہی ہیں۔

یہ ایسا معاشرہ ہے۔ جہاں پر کسی کو تھوڑی سی بھی طاقت مل جائے تو وہ فرعون بن جاتا ہے۔ پھر اس کے من میں جو آئے کرتا پھرے، کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ نواب خان ایس ایچ او اسی معاشرے کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ اس کی بیٹی سھودی اور بیٹا سھودا بھی اسی معاشرے میں سانس لے رہے ہیں۔ جب سھودی کے پاس دولت نہیں آجاتی تو وہ ایک کاروباری شخصیت نہیں بن جاتی اس کے پاس پناہ گاہ قائم نہیں ہو پاتی۔ اس وقت تک معاشرہ اس کے کردار کو بدکردار ہونے کے نقطہ نظر سے جانچتا ہے۔ سھودی دلدار عالم سے کہتی ہے۔

> "اچھی طرح جانتی ہوں لوگ میرے پیچھے برائیاں کرتے ہوں گے، کرتے رہیں۔ میرا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں صاحبِ ثروت کو منہ پر برا کوئی نہیں کہتا ۔بلکہ خوشامد کرتے ہیں جب کہ غریب کو ناکردہ گناہ پر سرِعام ذلیل و رسوا کرکے رکھ دیا جاتا ہے۔ زندگی میری اپنی، تو میں لوگوں کی پسند ناپسند کے مطابق زندگی کیوں گزارتی۔"[۲۲]

جب وہ معاشرے میں ایک مقام پالیتی ہے تو لوگ اسے بکھیوں والی سرکار کے نام سے یاد کرنے لگ جاتے ہیں ۔ اس کی عزت واحترام اور قدر شناسی سے کوئی فرد گزاشت نہیں کرتے۔ یہی کچھ معاشرے میں ہورہا ہے۔ اگر اس کے پاس دینے کو دولت یا پناہ گاہ موجود ہے یا وہ لنگر بانٹ سکتی یا بانٹ سکتا ہوتا تو کیا معاشرہ اسے پاکیزگی کے سنگھاسن پر بٹھانے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اسے مقدس کردار بنا دیتا۔ سھودی بھی ایسا ہی کردار بن کر سامنے آتی ہے۔ جسے معاشرہ اپنے تمام ترکج رویوں کے باوجود قبول کرلیتا ہے۔ سھودی کا کردار ایک ایسے ہی معاشرتی کردار کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول "حبس" میں معاشرتی مسائل کی ترجمانی محمد الیاس نے عمدگی سے کی ہے جو ان کے گہرے سماجی شعور کی عکاس ہے۔

محمد الیاس نے "حبس" کے اندر ہم جنس پرستی کو بھی بیان کیا ہے۔ ہے۔ موجودہ دور میں یہ برائی معاشرے میں تیزی سے پھیل رہی ہے۔ جس کو محمد الیاس نے نواب خان ایس ایچ او کے کردار سے واضح کیا ہے۔ ایس ایچ او نواب خان کے پاس ایک لڑکا گوگی شکایت لے کر آتا ہے کہ اس کے کلاس فیلوز اس کے ساتھ بد فعلی کرنا چاہتے ہیں اسے بچایا جائے۔ نواب خان ایس ایچ او اس لڑکے کو بچانے اور ملزموں کو قانون کے کٹہرے میں لانے کے بجائے اس لڑکے کے ساتھ خود بد فعلی کرتا ہے۔ گوگی جب شکایت درج کروانے آتا ہے۔ تب نواب خان ایس ایچ او اس سے ثبوت مانگتا ہے اور کہتا ہے:

"زیارتی کا نشانہ بننے والی عورت ہو یا مرد، جب سرکاری ہسپتال کا ڈاکٹر اس کا معائنہ کر کے رپورٹ لکھ دے تو مجرم خواہ ملک کے صدر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، سزا سے نہیں بچ سکتا۔ بس پانچ منٹ لگیں گے۔ تم یہاں سے پکے ثبوت کے ساتھ تھانے پہنچ کر ڈیوٹی محرر کو بیان دوگے کہ شادے بدمعاش نے زبردستی کی ہے۔۔۔ بے آبروئی کا کھیل اختتام پذیر ہوتے ہی گوگی کی عقل ٹھکانے آگئی۔ جس غلیظ حرکت سے بچنے کی خاطر وہ دادرسی کے لئے سرگرداں تھا، وہی اس کے ساتھ عجب فریب کاری کے پردے میں ہو چکی تھی اور عدل گستری ہی اس کا مرتکب ہوا جو ہنوز حیوانی رُوپ میں چارپائی پر بے سُدھ پڑا اونگھ رہا تھا۔ ذلت ورسوائی کے شدید احساس نے گوگی کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ لباس پہن کر تھانے کے لئے نکلنے کی بجائے میز سے آم کے رس میں لتھڑی ہوئی چُھڑی اُٹھائی اور تھکن کے نشے میں چُور بدن پر اوندھے ماندے پڑے لجلجے عضو کو ایک ہی وار میں کاٹ کر الگ کر دیا۔"[۲۳]

اس واقعہ سے سماج کے انتہائی اہم مسئلہ کی ترجمانی کی گئی ہے۔ جہاں افرادِ معاشرہ ہی نہیں بلکہ قانون کے محافظ بھی ہاتھ صاف کرنے سے نہیں چوکتے۔ یہ ہمارے معاشرے کا نہایت اہم مسئلہ ہے۔

یہ ایسا معاشرہ ہے۔ جہاں پر خواجہ سرا ہونا کسی جرم سے کم نہیں۔ خواجہ سرا کو چاہنے یا چاہے جانے کی آزادی بھی حاصل نہیں ہے۔ ایسا معاشرہ جو خود کو اخلاقیات کا علمبردار کہتا ہے۔ اس معاشرے میں ضلعدار جیسے بڑے عہدے دار کے ہاں بھی خواجہ سرا کی پیدائش ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس معاشرے کے اندر ان کی کوئی زندگی نہیں ہے۔ اس حوالے سے لوگوں کی منافقت اس وقت اور بھی کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جب خواجہ سرا کو یہ کہہ کر خیرات دیتے ہیں کہ ان کو خیرات دینی چاہیئے کہ ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور بد دعائیں بھی عرش تک پہنچتی ہیں۔ لیکن یہ دعائیں اور بد دعائیں دینے والے کردار جن کی دعاؤں اور بد دعاؤں پر معاشرہ یقین رکھتا ہے۔ انہیں اپنے جیسا انسان قرار نہیں دے پاتا۔ محمد الیاس اس طبقے کی عکاسی گُورو کی زبانی دردناک الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"لوگ ہمیں انسان نہیں سمجھتے اور نفرت کرتے ہیں، یہ نہیں جانتے کہ ہمارے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔۔۔ خدا ہی جانے ہمیں دنیا میں کیوں بھیجا؟۔ ہو سکتا ہے، پیدا کرنے والے کی یہی منشا ہو کہ اس کے بندے ہم سے نفرت کریں، مذاق اڑائیں۔"[۲۴]

اس پر وجی شاہ سندری کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

"معاشرے میں عام لڑکے لڑکی کی محبت کو برداشت نہیں کیا جاتا تو ایک شریف گھرانے کے لڑکے کے ساتھ ایسے انسان کی محبت کا سلسلہ کب تک چل سکتا ہے، جس کو اللہ نے پوری عورت پیدا کیا نہ پورا مرد۔"[۲۵]

معاشرتی تقسیم کے اندر یہ پسا ہوا طبقہ ہے۔ جنھیں دو وقت کی روٹی کمانے کے لیے ناچ گانا کرنا پڑتا ہے یا پھر بدکاری۔ محمد الیاس نے اپنے ناول کے ذریعے نہ صرف ان کرداروں کے دکھ کی ترجمانی کی ہے بلکہ سماجی تقسیم، طبقاتی کشمکش اور معاشرتی مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔

ج۔ اخلاقی اقدار کا انحطاط

اگر محمد الیاس کے ناول "حبس" کے تناظر میں اخلاقی اقدار کے انحطاط کی بنیادی وجہ تلاش کریں تو وہ یہ ہے کہ لمحہ موجود میں زندگی کے جس شعبے پر نظر دوڑائیں ہر جگہ انحطاط وزوال پذیری نظر آئے گی۔ جوں جوں انسانی زندگی پر مذہب کی گرفت کمزور ہوتی گئی ہے اور مادیت کو توانائیاں ملتی گئی ہیں۔ توں توں ہر کہیں زوال پھیلتا چلا گیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسانوں نے جب بھی اخلاقیات سے روگردانی کی انہیں بے پناہ نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ آج کے دور میں شاید انسان پہلے کی بہ نسبت غیر محسوس مادیت گزیدہ اور روحانیت سے بہت دور ہو گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں اخلاقی اقدار پہلے کی نسبت بہت کمزور ہو گئی ہیں اور اخلاقی اقدار کا انحطاط ہر کہیں عام ہو گیا ہے۔

ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ ہر عہد کا ادب اپنے دور کی اقدار کی ترجمانی کرتا رہا ہے۔ کلاسیکی شاعری ہو یا جدید شاعری، ناول، افسانہ، انشائیہ، ڈرامہ ہو یا سفر نامہ الغرض ہر طرح کی اصنافِ ادب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور کے اندر زندگی میں پائے جانے والے تضادات، اخلاقیات کی بہتری یا ابتری، سب کے پیمانے مل جائیں گے۔ اگر معاشرہ طوائف کے کوٹھے پر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا ہے یا قحبہ خانے میں جا پڑا ہے تو "امراؤ جان ادا" کی صورت میں ایک شاہکار ہمیشہ ایک زمانے کی لکھنوئی معاشرے کی داستان سناتا رہے گا۔ اسی طرح اگر ظلمتوں کی کسی نئی تاریک رات کا آغاز کرتا ہے اور بہت سے مظلوم انسانوں کا خون اپنے نظریے کی ترویج کے لئے بہا دیتا ہے تو اس کی ترجمانی "فردوسِ بریں" کے اندر مل جائے گی۔ اسی طرح انگریزوں نے برصغیر کے اندر اپنے قدم گاڑھ لیے اور عہدِ مغلیہ زوال آشنا ہو جاتا ہے۔ نازونعم میں پلی شہزادیاں اور دولت کی ریل پیل میں کھیلتے شہزادے خاک آلود ہو گئے۔ ان کی زندگیوں پر کیا بیتی ہے۔ ان کے آنسوؤں کی داستان خواجہ حسن نظامی کے افسانوں میں مل جائے گی۔ بدقسمتی سے طبقہ نسواں کو ہر زمانے میں،

ہر خطے میں اور ہر معاشرے میں وہ عزت و تکریم نہیں دی گئی۔ جس کا یہ طبقہ مستحق ہے۔ برصغیر کا معاشرہ بھی اس اخلاقی گراوٹ سے مبرا نہیں ہے۔ اس کی مثالیں علامہ راشد الخیری کے ناولوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اسی طرح نزیر احمد اپنے عہد کی اخلاقی انحطاط کے زوال کا داستان گو ہے۔

بد قسمتی سے جوں جوں تاریخ یا معاشرے آگے کا سفر طے کرتے رہے ہیں۔ توں توں اخلاقی انحطاط بڑھتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ مظلوم و مجبور انسانوں کی مجبوریوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ جب ہجرت کے واقعات اور حادثات پڑھتے ہیں۔ اس زمانے کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو کئی چشم کشا واقعات اور حادثات نظروں کے آگے سے گزر جاتے ہیں۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ ناصر کی شاعری میں ہجرت بد نصیبوں کا نوحہ ہے تو غلط نہیں ہو گا۔ تقسیم کے موضوع پر برصغیر کے اندر کثرت سے ادب لکھا گیا ہے اور ہر جگہ اخلاقی قدروں کے انحطاط کی کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی۔ منٹو، غلام عباس، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، انتظار حسین، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور احمد ندیم قاسمی جبکہ شاعری میں فیض، فراز، عدیم ہاشمی کے ہاں قدروں کے زوال کی تاریخ عہد بہ عہد پڑھنے کو مل جائے گی۔

محمد الیاس عہد حاضر میں ادب کی اسی روایت کے پاسدار ہیں۔ یہ روایت جو ہر خطے، ہر معاشرے، ہر عہد، ہر زبان میں رنگ و نسل سے ماوراہو کر نبھائی گئی ہے۔ محمد الیاس اس روایت کے امین ہیں۔ ان کے ناول کے اندر اور معاشرے کے کتنے ناسوروں پر نشتر زنی کی گئی ہے۔ ان کے کردار معاشرتی قدروں کے اندر پیدا ہو جانے والی زوال پذیری کو بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

برصغیر کے بالعموم اور پاکستان کے بالخصوص مسائل کیا ہیں۔ ان کے اندر بسنے والے معاشروں کی قدروں کے اندر کہاں کہاں کہاں زوال سرایت کرتا جا رہا ہے؟۔ یہ تقریباً ان معاشروں کا مشترک مسئلہ ہے۔ یہاں پر مدت مدید سے جاگیر داری نظام اور اس کے کل پُرزے تاب و توانائی پاتے رہے ہیں۔ جاگیر داری نظام کس حد تک ظلم اور استحصالی نظام کو پروان چڑھانے میں معاون ہوتا ہے۔ ان کی تاریخ پڑھ لیجئے جہاں پر اس نظام سے چھٹکارا پایا گیا ہے۔ بالخصوص عوامی جمہوریہ چین اور روس کے معاشروں کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں۔ خوش قسمتی سے جدید زمانے کے بہت سے معاشروں نے جاگیر دارانہ نظام سے اپنی جان چھڑالی ہے۔ لیکن پاکستان آج بھی اس نظام کا شکار ہے۔ علی عباس جلالپوری اس حوالے سے رقمطراز ہیں۔

"ہمارے ہاں جاگیر دار اور صنعت کار اعلیٰ طبقے میں شمار ہوتے ہیں اور تاجر مزارعہ (یوسف زئیوں کے علاقے مزارعین کو فقیر کہا جاتا ہے) اور اہلِ حرفہ کا مرتبہ کمتر ہے

اہلِ حرفہ کو کمین یا کمینہ (لغوی معنی کام کرنے والا) کہتے ہیں۔ ان میں لوہار، ترکھان، موچی، نائی، کمہار، ماچھی وغیرہ شامل ہیں۔"[۲۶]

اس نظام کی وجہ سے معاشرتی اقدار، سیاست، صنعت ہر کہیں قدروں کا زوال عام ہو گیا ہے۔ کیونکہ جب جہاں اخلاقیات پروان چڑھے گی وہاں جاگیر داری نظام پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اسی طرح شہنشاہی زمانہ ہو یا انگریزی عہد سبھی نے اپنے اپنے مفاد کی خاطر جاگیر داری نظام کو توانائی بخشنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظام کی وجہ سے کس طرح یہ مسائل پیدا ہوئے ہیں ادب کے اندر ان سب کا بیان ہوا ہے۔ محمد الیاس کے ناولوں میں بھی اس حوالے سے اچھا خاصا لکھا گیا ہے۔ گویا معاشرتی اقدار کے زوال کا ایک کُل پُرزا انہوں نے بیان کر دیا ہے اسی طرح ملائیت جسے دوسرے الفاظ میں ایک ایساروپ جس کے اندرون اور بیرون میں تضادات پائے جاتے ہو کا بیان بھی کیا ہے۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کے اندر چلن رہا ہے کہ ملائیت کے ذریعے لوگوں پر اپنی گرفت مضبوط کی جائے انہیں خدا اور رسول ﷺ کے نام پر ڈرایا جائے۔ خدا اور رسول ﷺ کے نام پر ان سے بہت سے کام نکلوائے جائیں۔ اور خود خدا اور رسول ﷺ کی تعلیمات سے بے بہرہ رہیں۔ برصغیر کے اندر گئے زمانے سے آج تک برہمن اور شودر والے اعتقادات مذہبی طبقوں میں موجود رہے ہیں۔ ملائیت جو اپنے سوا سبھی کو گمراہ تصور کرتی ہے۔ اپنے فائدے کے لئے مذہب کو کسی بھی طرح استعمال کر سکتی ہے۔ ادباء اور شعرا نے اپنی تخلیقات میں اس طبقے کو واشگاف انداز میں واضح کیا ہے۔ محمد الیاس کے ناول "حبس" کے مطالعہ سے معاشرتی تضاد کا یہ رخ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس ناول میں معاشرے کے اندر بڑھتی ہوئی اخلاقی زوال پزیری ہر لحظہ نظر آتی ہے۔ "حبس" پڑھ کر یہ احساس بہت بڑھ جاتا ہے۔ جاگیر داری نظام، ملائیت، پولیس کا غیر حقیقی رویہ، ناشر کے منفی رویے، خواتین کے حقوق کی پامالی، پیری مریدی کے ذریعے سادہ لوح عوام کو لوٹنا، محبتوں کا زوال اور فوٹو گرافر کی اخلاقی انحطاط پذیری زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ فوٹو گرافر کی بلیک میلنگ موجودہ دور کا اہم سماجی مسئلہ ہے۔ کمال ایک طرف بلیک میل کرتا اور دوسری ان تصاویر کے ذریعے جنسی ذہنیت کو فروغ دے رہا ہے۔

"افواہیں گردش کیا کرتی تھیں کہ فوٹو گرافر میں خصوصاً کمال برہنہ تصویروں کا دھندہ بھی کرتا ہے۔ بقول اس کے، خالی خولی فوٹو گرافی میں تو ڈھنگ کی دال روٹی بھی نہیں چلتی، جب کہ اس طرح کا پرنٹ جنسی مریض معاشرے میں پانچ سے دس روپے میں آسانی سے بک جاتا ہے۔ اس بیہودہ کاروبار میں ملوث فوتو گرافر کے روابط بڑے شہروں

تک ہیں۔ نیٹ ورک میں شامل گشتی نمائندے مناسب کمیشن پر ہول سیل کا مال ایک سے دوسرے شہر پہنچا دیتے ہیں۔ کمال نے گھروں میں کام کرنے والی سولہ سترہ لڑکی کی تصویر اتاری اور بے لباس نوجوان بدن پر کسی ایکسٹر انڈین اداکارہ کا سر جوڑ کر ہول سیل کا سودا مارکیٹ میں بیچ دیا۔ کئی مقامی لوفروں نے بھی پانچ پانچ روپے میں پرنٹ خرید کر اپنی جیسی تیسی ذہنیت کی تسکین کرنے کے علاوہ دیگر اسی قماش کے ہم عصروں کے ذوق کا بھی خیال رکھا۔"[۲۷]

"حبس" کے اندر یہ احساس زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے کہ اس معاشرے کا رُخ درست سمت میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر دلدار عالم کی ساس اپنے داماد کی جاسوسی بھی کرواتی ہے۔ اس سے معاشرے کی سمت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ جب کسی معاشرے میں ساس اپنے ہی داماد کی جاسوسی کروانا شروع کر دے۔ اور ہر دن کی رپورٹ اپنی بیٹی کو اپنی کو بھی دینے لگے۔ جس سے اس کی بیٹی علم بیزار ہو جائے اور اسے میڈیکل کالج چھوڑنا پڑے۔ یہ اخلاقی زوال پذیر معاشرے کا واضح اظہار ہے۔ ریحانہ اپنی والدہ کی دلدار عالم کی جاسوسی کروانے کے بارے میں بیان کرتی ہے۔

"میری اماں جس مذہبی تنظیم کے خواتین ونگ کو راہوالی میں ہیڈ کر رہی ہیں، یہ پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کی کالونی میں بھی اس کے چند سنجیدہ اور ذمہ دار نمائندے رہتے ہیں۔ ان میں کسی کا بھی تعلق آپ کے ڈیپارٹمنٹ سے نہیں۔ اماں تک آپ کی ہر خبر پہنچتی رہی ہے۔۔۔ آپ کے بارے میں یہی رپورٹ ملتی رہی کہ دلدار عالم باکردار ہے لیکن حکومتِ وقت کی پالیسیاں ایسی ہیں کہ فحاشی اور بے حیائی کو فروغ مل رہا ہے۔ معاشرتی برائیاں پہلے بھی کم نہ تھیں مگر اب حد کراس ہو گئی ہے۔ بد کردار عورتوں نے مسلسل آپ کا پیچھا کیا۔ جوان اور صحت مرد اور وہ بھی تنہا، مال زادیاں جس کے پیچھے پڑ گئی ہوں آخر کب تک دامن داغ ہونے سے بچا پائے گا۔ اور آپ کے پاس مادر پدر آزاد ملحد اور بے دین بد چلن افراد کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ بلکہ آپ کے دوست بنے ہوئے ہیں اور جو کسی بڑے افسر کی بیٹی، میڈیکل آفیسر آپ پر لٹو ہو گئی۔ بے حیا نے دن دہاڑے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔ وہ تو شور مچ گیا ورنہ اللہ جانے کیا ہو جاتا۔"[۲۸]

ریحانہ اپنے شوہر کو بتاتی ہے کہ میڈیکل کالج کے اندر زیرِ تعلیم طلبا و طالبات کس قدر اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہو رہے ہیں۔ فاضل ناول نگار کے اس بیان کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے اداروں کا مطالعہ کریں تو اس نام نہاد جدید دور میں کتنے طلبا و طالبات اس کا شکار ہو چکے ہیں۔ وہ نہ صرف معاشرے بلکہ خود اپنی ذات کو دھوکہ دینے میں مگن ہیں۔ اس طرح معاشرے صحت مند نہیں رہتے۔

"میڈیکل میں داخلہ ملنے پر یہی سوچا تھا کہ تعلیم مکمل ہونے پر شادی کروں گی، لیکن بعض آوارہ لڑکیوں کے معاشقوں کی تشہیر نے چند اچھی خاصی سلجھی ہوئی شریف لڑکیوں کے ذہن بھی خراب کر دیئے اور وہ گمراہ ہو گئیں۔ مجھے بھی مختلف ذرائع سے پیشکش ہونے لگیں اور ایک امیر زادے نے توزچ کر کے رکھ دیا۔"[۲۹]

معاشرے میں کثیر تعداد میں ایسے نسوانی کردار مل جاتے ہیں۔ جو زندگی کی ابتدائی منزلوں میں ہی اپنی سب سے قیمتی متاع گنوا بیٹھے ہیں۔ یورپ میں تو خیر یہی چلن عام ہو چکا ہے۔ اب ہمارا معاشرہ بھی مغرب کی تقلید میں اپنے راستے کی جانب گامزن ہے۔ محمد الیاس اس اخلاقی بے راہ روی کو دیکھ کر دل جلاتے ہیں۔ اگرچہ سھودی میں سوگن تھے۔ لیکن زندگی کے ابتدائی برسوں میں ہی وہ اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہو گئی۔ وہ ایک ایسی لائبریری کی لائبریرین کا شکار ہوئی۔ جو ظاہر اتو کتابیں پڑھنے پڑھانے کا کاروبار کرتا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ اخلاقی گراوٹ زدہ کتابیں پڑھا کر بہت سی لڑکیوں کو پھانس تھا۔ سھودی بھی ان میں سے ایک تھیں۔ جو اس کا شکار ہوئی۔

"ثاقب نے لائبریری میں ممنوعہ کتب بھی رکھی ہوئی تھیں۔ ہر عمر کے مرد و خواتین کتابیں کرائے پر لیا کرتے، جن میں سے بعض ثاقب کی مطلوب و مرغوب قماش کے بھی تھے۔ چند بگڑے ہوئے لڑکوں کی ٹولی زیادہ وقت لائبریری پر ہی گزارتی۔ موقع پر ملاقاتوں کے علاوہ کتابوں کے ذریعے رقعہ بازی بھی ہو جاتی۔ ثاقب نے خود جس پر نظر رکھی ہوتی، خوب سوچ سمجھ کر بڑی رازداری سے کوئی ایسی ویسی کتاب بھی تھما دیتا۔ نتائج مثبت برآمد ہونے نہ ہونے کے آثار بھانپنے کا آزمودہ نسخہ بروئے کار آتا۔ اظہارِ برہمی کی صورت میں فوراً بیٹی بہن کا رشتہ جوڑ کر معافی مانگ لی جاتی۔۔۔ سخت روِ عمل کے برعکس خاموشی کو عین رضامندی تصور کر لیا جاتا اور سلسلہ چل نکلتا۔ جب کہ ڈھلمل رویہ اختیار کرنے پر دیگر شائقین کا حوالہ دیتے ہوئے ہمت بندھائی جاتی۔

تعلق استوار ہونے پر استحکام اور پھر منطقی انجام کی جانب تیزی سے پیش قدمی جاری رہتی۔ دکان کی عقبی دیوار اور ریک کے درمیان حصولِ مقصد کے لیے گوشۂ عزلت کا اہتمام کر رکھا تھا۔"[۳۰]

یہ اخلاقی گراوٹ کی سب سے بڑی مثال ہے۔ علم تو پاکیزگی کا عکاس ہوتا ہے اور گمراہوں کو راہ راست پر لانے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہی نہیں کہ وہ بالغ نظری اور ذہن کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی روحانی پاکیزگی بھی پڑھنے والے کی رگوں میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ یہ کیسا علم ہے جو ایک لائبریری میں پڑا ہوا ہے۔ جو اسے پڑھتا جاتا ہے۔ جنس زدہ ہو جاتا ہے۔ یہ کیسے لکھنے والے ہیں کہ ان کو پڑھنے والا درست سمت کی جانب سفر کرنے کے بجائے منفی راستوں کا مسافر بن جاتا ہے۔ ایک مصنف ذہنی اعتبار سے جب اخلاقی گراوٹ کے اسفل اسافلین مقام پر پہنچ جائے تو اس طرح کا ادب تخلیق کرتا ہے۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ آج پاکستانی معاشرے کے اندر اس طرح کی سینکڑوں کتابیں اور رسائل لکھے جا رہے ہیں جو نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو منفی تربیت دے رہے ہیں۔ ان کے ذہنوں کو بدعنوان بنا رہے ہیں۔ محمد الیاس نے لائبریرین اور لائبریری میں موجود کتابوں کے ذریعے اس اخلاقی زوال کی جانب توجہ دلائی ہے۔ دوسری جانب مذہبی منافقت کا پردہ بھی چاک کیا ہے کہ جب ثاقب لائبریرین سزا کاٹ کر واپس آتا ہے تو وہ مولوی ثاقب بن چکا ہوتا ہے۔

"سزا کاٹ کر تقریباً چار سال بعد جب گھر پہنچا، تو نرالے ہی رُوپ میں تھا۔ بہت خوبصورت داڑھی بڑھا رکھی تھی۔ پیشانی پر محراب، سر پر ٹوپی اور لبوں پر ہر وقت کلام پاک کا ورد۔ پہلی نظر پڑتے ہی یقین ہونے لگتا کہ پختہ کار پابندِ صوم وصلٰوۃ ہے۔ لباس بھی مستقلاً بدل ڈالا اور شلوار قمیض کے علاوہ کبھی کچھ نہ پہنا۔ بیوی بچوں کو سسرال سے منالایا۔ لائبریری کی کتابیں ساری جیل جانے پر بیچ دی تھیں۔ اب اس نے نئے سرے سے کاروبار شروع کیا تو تاج کمپنی کے قرآن پاک اور دینی کتب کا سٹاک ڈالا۔ حلیہ ہی ایسا تشکیل پا گیا کہ بغیر کسی تحریک کے لوگ خود ہی مولوی کہنے لگ گئے اور وہ بہت جلد مولوی ثاقب کے نام سے مشہور ہو گیا۔"[۳۱]

اسی طرح سھودی اور سھودا کے کردار کو دیکھ کر اور تھانیدار نواب خان کے رزق پر نگاہ ڈالتے ہوئے "راجہ گدھ" کی مثال سامنے آتی ہے۔ بانو قدسیہ نے اپنے ناول "راجہ گدھ" میں ایک نظریہ پیش کیا تھا۔ جس

کے مطابق لقمہ حرام کھانے والے کی جینز میوٹیشن ہو جاتی ہے۔ یہ جینز میوٹیشن کئی نسلوں تک چلتی رہتی ہے۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

"مغرب کے پاس حرام کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی جینز کو متاثر کرتا ہے۔ رزقِ حرام سے ایک خاص قسم کی میوٹیشن ہوتی ہے جو خطرناک ادویات، شراب اور ریڈیشن سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزقِ حرام سے جو جینز تغیر پذیر ہوتے ہیں وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ نااُمید بھی ہوتے ہیں ۔۔۔ یقین کر لو رزقِ حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم رزقِ حرام کھانے کا چسکا پڑ جاتا ہے، وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں۔"[۳۲]

محمد الیاس کے ہاں بھی یہ تصور ذرا مختلف کردار کے ذریعہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ تھانیدار نواب خان کا کردار پاکستان کے روایتی تھانہ کلچر کا عکاس ہے۔ پاکستانی پولیس ہو یا برصغیر کے دیگر معاشروں کی پولیس یا تھانہ کلچر تقریباً سبھی میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ صرف اسلام ہی نہیں ہر مذہب لقمہ حرام کو درست عمل قرار نہیں دیتا۔ عدل کیا ہے؟ جب حقدار کو اس کا حق مل جائے یا با الفاظ دیگر حق حقدار کے پاس موجود رہے۔ یہ عدل ہے۔ اگر حق کسی بھی وسیلے سے حق دار سے چھین کر کسی اور ایسے فرد کو دے دیا جائے جو اس کا حقدار نہیں ہے تو یہ ظلم ہے۔ برصغیر کے معاشروں میں اس کا چلن عام ہے۔ یہاں پر تھانوں کے اندر جس طرح کی اخلاقی برائیاں سرائیت کر چکی ہیں انھیں جان کر اور پڑھ کر صاحب دل شخص کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ "حبس" کے تخلیق کار کی نظر اس اخلاقی انحطاط کی جانب بہت گہری ہے۔ تھانے دار نواب خان کا کردار ہمارے تھانہ کلچر کی عکاسی ہے۔ سھودی اپنے والد کی نوکری کا تذکرہ یوں کرتی ہے:

"قبلہ والد صاحب جب منشی محرر ہوا کرتے تھے، ان کے بارے میں مشہور ہے کہ رپورٹ درج کرنے سے حتی الوسع پرہیز کرتے۔ سائل سے کہتے؛ پولیس کے پاس کرنے کو اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ تمہیں جس پر شک ہے، اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرو، ہم بھی کریں گے۔"[۳۳]

اکثر پولیس افسر رزق حرام کھاتے ہیں۔ رشوت لیتے ہیں، ظلم کرتے ہیں۔ انسانوں کی توقیر ان کے دل و دماغ میں کہیں جاگزین نہیں رہتی اور پھر یہ عام مشاہدہ ہے کہ ان کی جینز میوٹیشن ہو جاتی ہے۔ انہوں نے معاشرے کے اندر جس قدر بد اخلاقی پھیلائی ہوتی ہے اور جس طرح انہوں نے معاشرے کی پاکیزگی پامال کی ہوتی ہے وہی کچھ انہیں لوٹا دیا جاتا ہے۔ مکافات عمل شروع ہو جاتا ہے۔ فاضل ناول نگار اپنے ناول "حبس" کے اندر ان خلاقی قدروں کی زوال پذیری کے انحطاط کو بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

ایک شخص حرام تو کھاتا ہی ہے بد فعلی کا ارتکاب کرنے سے بھی نہیں چونکتا۔ ایک نوجوان نواب خان کے پاس شکایت لے کر جاتا ہے کہ کچھ بد اخلاق لڑکے اس کے ساتھ بد فعلی کرنا چاہتے ہیں۔ بطور پولیس افسر تھانیدار نواب خان کا یہ فرض تھا کہ وہ نہ صرف اس لڑکے کا محافظ بنتا بلکہ اس کے پیچھے پڑے ہوئے لڑکوں کو سزا بھی دیتا۔ لیکن اس کا باوا آدم ہی نرالا نکلا وہ خود اسی راستے سے گزر گیا۔ جس راستے سے اس نے دوسرے لوگوں کو ہٹانا تھا۔ آج معاشرے کے اندر بہت سے ایسے کردار مل جائیں گے۔ جنہوں نے اس راستے پر سفر کیا ہو گا وہ خود شکار بنے یا انہوں نے شکار کیا۔ یہ ایک معاشرے کے اندر اخلاقی گراوٹ کی بدترین مثال ہے۔ ایک سچے اور کھرے تخلیق کار کی مانند محمد الیاس نے معاشرے کے اندر پنپتی ہوئی اس منفی قدر کی جانب ہماری توجہ کر دی ہے۔

محمد الیاس نے معاشرے میں خواتین کے ساتھ روا رکھے گئے سلوک کو بھی حساسیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ عورتوں کے حقوق اور بالخصوص شادی جیسے حساس معاملے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> "وہی صدیوں پرانا جھگڑا۔۔۔ اس دھرتی کی بیٹی کو اس کا باپ اپنی مرضی کے مرد کی آغوش میں دینا غیرت کا تقاضا تصور کرتا ہے۔"[۳۳]

اس معاشرے میں خواتین کے حقوق کا صلب ہوتے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ اس کو برائی ہی نہیں سمجھا جاتا، بلکہ لوگ اس کو مردانگی سمجھتے ہوئے اس گناہ کا ارتکاب کرتے آئے ہیں۔ یہ نہ صرف مذہبی بلکہ اخلاقی قدروں کا زوال بھی ہے۔ جیسا کہ سردار نواب خان جو جنسی قوت کھو بیٹھا لیکن اس نے اپنی شریک حیات کو کس بات کی سزا دی ہے کہ وہ ساری زندگی اس کے سہارے پڑی رہتی ہے۔

اس استحصال کی دوسری مثال کشور کے کردار میں ملتی ہے۔ جہاں عورت کے استحصال کا ایک الگ پہلو سامنے آتا ہے۔ کشور دلدار عالم سے محبت کرتی تھی، لیکن اس کے باپ نے اسی وزیرستان کے ایک ایسے پٹھان کے پلے باندھ دیا جو نہ صرف پہلے صاحب اولاد تھا۔ بیوی بچوں والا تھا بلکہ بد اخلاق اور بڈھا بھی تھا۔ وہ کشور جو سر شام جرمن شیفرڈ کو لیے جینز پہنے اپنی سہیلی کے ساتھ واک پر نکلی تھی۔ اسے ایک شرابی موٹے اور خراٹے مار شخص کی بیوی بنا دیا گیا۔ محمد الیاس اس استحصال کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

> "ہمارے معاشروں میں عورتوں کے حقوق کی کیا بات کی جائے۔ عورت اپنی رضا سے جس مرد کے پاس سونا چاہتی ہے۔ اسے غیرت کا مسئلہ بنا دیا جاتا ہے اور اسی عورت کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے سرپرستوں کے منتخب کئے ہوئے مرد کے ساتھ سوئے یہ غیرت کا معاملہ ہے یا پہلے والا غیرت کا معاملہ تھا"[۳۴]

اس معاشرے کا عجب تضاد یہ ہے کہ یہاں طبقہ نسواں کے حقوق کی پامالی کو مذہبی مسئلہ سمجھا ہی نہیں گیا۔ یہ اخلاقی انحطاط ہر آنے والے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے یہیں پر ناول کے ہیرو کا تعلق اپنی بیوی کے ساتھ دیکھئے وہ میڈیکل کالج کی طالبہ ہونے کے باوجود جب ہر روز رنگ برنگے قصے سنتی تو خود کو غیر محفوظ تصور کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا کر اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئی۔ ناول نگار معاشرے کے اندر اخلاقی قدروں کے اس قدر زوال کو بیان کرتے ہیں۔ عورت اس قدر غیر محفوظ ہو کر اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا سکتی ہے۔ اس ڈر سے کہ اس کا شوہر تین لفظ بھیج کر اس سے تعلق منقطع نہ کر دے اور یہ طبقہ نسواں کے ساتھ ساتھ برصغیر کے معاشروں کے بلکہ عالمی معاشرے کے اخلاقی زوال کی مثالیں بھی ہیں۔

ناول میں ایک نسوانی کردار مسرت کا ہے جو ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلام آباد میں رہتی ہے۔ جو پاکستان کے اشرافیہ کا شہر ہے۔ اس کا شوہر اسے چھوڑ کر امریکہ چلا گیا۔ ان کی طلاق نہیں ہوتی یہ اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہے لیکن کچھ دیر باقی ہے۔ اس کی اولاد یہاں پر پڑھ رہی ہے اور یہ اپنی نسوانی تسکین کی خاطر جگہ جگہ ذلیل و خوار ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے طعن و تشنیع کا نشانہ بھی بنتی ہے۔ اس کا شوہر اسے کھل کھیلنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس نے بہت پہلے بیوی کے ساتھ معاہدہ کر لیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو قطعاً نہیں روکیں ٹوکیں گے۔ مزید یہ کہ علحیدگی اختیار کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مسرت اپنے میاں کے بارے میں بیان کرتی ہے۔

"میاں بہت عیاش ہے۔ عورت اور شراب کے بغیر اس کی رات نہیں گزرتی۔۔۔۔ وہ
ایک ہی بات بولتا؛ تم ہم کو نہ چیڑو (چھیڑو) ہم تم کو نہیں چیڑے (چھیڑے) گا۔"[۳۵]

اس خاتون کے کردار کے پردے میں دو رویے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک تو خواتین کے حقوق کی پامالی اور دوسرا معاشرتی تضاد۔ ناول نگار توجہ معاشرے کے ایک ایسے رخ کی طرف کروانا چاہ رہے ہیں۔ جس کے بارے میں بہت کم لوگ سوچتے ہیں۔ مرد حضرات شادی کرنے کے بعد اپنی منکوحہ کو بے یارومددگار چھوڑ کر دیار غیر چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی روٹی کا سوچتے ہیں۔ دولت کی فکر کرتے ہیں۔ مستقبل پر غور کرتے ہیں۔ لیکن ایک لمحے کے لئے بھی اس مظلوم کے بارے میں نہیں سوچتے۔ جو ان کی غلام بن کر ان کے گھر میں آن بیٹھی ہے اور اگر وہ بے راہ روی کا شکار ہو جائے تو لمحہ بھر میں اسے نشان عبرت بنا دیتے ہیں۔ کیا یہ بد اخلاقی نہیں؟ کیا یہ مذہبی اور اخلاقی قدروں کی پامالی نہیں؟ اس کردار کی صورت میں محمد الیاس ہماری توجہ اس جانب مبذول کرواتے ہیں۔ معاشرے کی تنگ نظری دیکھئے کہ وہ برابر اس خاتون پر ملامت کرتا رہتا ہے یا ایسی ہی دیگر خواتین پر طعن و تشنیع کے تیر برساتا چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ اسُ مرد کے بارے میں بھی سوچیں جو اس عورت کو چھوڑ کر دیار غیر میں جا بسا۔ یہ معاشرے کی سوچ پر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو صرف مردوں کا معاشرہ بن کر رہ گیا ہے۔ اسی کے کردار کے پردے میں ایک اور معاشرتی تضاد کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ جب وہ برقع پہنتی ہے حالانکہ اس کی زندگی ایسی نہیں ہے کہ وہ باپردہ رہے۔ وہ پردے کے اندر بے پردہ ہے لیکن ہمارے رویوں اور ہماری قدروں میں اس قدر زوال برپا ہو گیا ہے کہ اب جابجا ایسے ہی کردار ملتے رہیں گے۔ جن کے ہاں یہ تضاد بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

جہالت لاعلمی حسد اور بغض ایک اور جرم ہے۔ اخلاقی انحطاط پذیری کی مثالیں اس سے جنم لیتی ہیں۔ راولپنڈی کی ڈاکٹر جو دیدار عالم کا چیک اپ اسی ذمہ داری کے ساتھ کر رہی ہے۔ جس کے ساتھ وہ دیگر خواتین کا چیک اپ کرتی ہے۔ بھلے اس کے دل کے اندر بہت سے نرم ولطیف جذبات مچل رہے تھے لیکن اس کے ساتھ کیا ہوا کیا؟ خواتین نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ وہ ان کی طبیب ہے اور ان کے لیے وہاں بیٹھی ہوئی ہے اس کے بجائے ان کے دل میں کینہ بغض اور عداوت بھر گیا اور انہوں نے اس مسحیا کی روح پامال کر دی۔ یہی نہیں اس قصے کو گھروں تک پہنچایا گیا اور مرد حضرات لطف لے لے کر ایک ایسی بات کو موضوع بناتے رہے جس کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔

"ہائے!!ہم بھی جانیں ایسی کیا افتاد آن پڑی کہ گھنٹہ بھر سے ایک ہی مریض کا ملاحظہ ختم ہونے کو نہیں آرہا۔۔۔دوسری نے لقمہ دیا:"اے بی بی!ہم گھر کے سو کام چھوڑ کے آویں اور تم ہو کہ اس لونڈے کا کب سے چیک اپ کیے جارہی ہو۔"لیڈر ٹایپ بڑی بی نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:"میاں صاحبزادے!تم زیادہ لاغر ہو تو ڈیوٹی کے بعد ڈاکٹر صاحبہ کے گھر چلے جایا کرو تاکہ تسلی سے تجھے دیکھ لیویں۔"[۳۶]

خواتین ہوں یا مرد کبھی ایک ایسی بات کی تصدیق کر رہے تھے جو تھی ہی نہیں۔بے بنیاد الزام اس معاشرے کا چلن بن گیا ہے اور اخلاقی انحطاط ان زوروں پر ہے کہ کوئی تھوڑی دیر کے لئے بھی نہیں سوچتا کہ تصدیق کے بغیر کسی خبر کو آگے بڑھانا مذہبی و اخلاقی لحاظ سے کتنا بڑا جرم ہے۔خود مذہب بلا تصدیق کسی واقعے کو آگے پہنچانے اس پر بحث کرنے اور اس پر یقین کرنے کے خلاف سخت ترین الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔

محمد الیاس نے اپنے اس ناول کے اندر معاشرے کے ان منفی رویوں اور اخلاقی انحطاط کو بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ اس ناول کو پڑھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ معاشرہ اخلاقی گراوٹ کے کس مقام پر ہے۔ کیونکہ ناول کے اندر پیش کئے گئے واقعات اور حادثات میں سے کوئی ایسا نہیں جو ہمارے ارد گرد وقوع پذیر نہ ہو رہا ہو۔

ایسا معاشرہ جہاں اخلاقی قدریں پنپ رہی ہوں ایک بہت ہی روشن خوبصورت اور حسین معاشرہ ہو سکتا ہے۔ اخلاقی قدروں کا پنپنا انسانی دلوں کے اندر کدروتوں، حسد، بغض اور وہ تمام منفی سرگرمیاں جن سے ایک معاشرہ منفی سوچ کا حامل ہو سکتا ہے۔ وہ ساری کی ساری اس سے رخصت ہو جاتی ہیں۔اس حوالے سے محمد الیاس لکھتے ہیں۔

"ایک اور وصف ہم میں بدرجہ اتم موجود ہے۔دھوکا دہی، جھوٹ، منافقت اور جائز و ناجائز ذرائع سے مال وزر سمیٹنے کی لامتناہی حرص و ہوس۔"[۳۷]

دنیا کے ایسے معاشرے جہاں اخلاقیات مذہب کے قائم مقام ہو گئی ہیں۔ وہاں انسانوں کی زندگیوں میں بہت آسانیاں پیدا ہو گئی ہے۔ جن معاشروں میں اخلاقی قدروں کا زوال ہوا ہے یا ہوتا جارہا ہے۔ وہاں انسانی زندگی بہت سی پستیوں میں گر گئی ہے۔جیسا کہ اس ناول کے آغاز کے بہت سے صفحات میں ایک ایسے کالج کا نظارہ دکھایا گیا ہے۔ جہاں طالب علم طرح طرح کی منفی سرگرمیوں میں ملوث ہیں کالج تو دانشمندی اور اخلاقیات سکھانے کا اہم ادارہ ہوتا ہے۔ وہاں پر تو انسان بنتے اور سنورتے ہیں۔ بہت سے خواب بنتے ہیں اور

ان کی تعبیر کے سنہری زمانوں کا آغاز ہوتا ہے۔ طالب علم تو بہت سی بالیدگیوں سے پاک ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں طالب علمانہ زندگی پاکیزہ اور پاوتر ہوا کرتی تھی۔ کسی قسم کا لالچ، بغض، حسد، کینہ، غنڈہ گردی، ظلم و زیادتی اور ہر طرح کی منفی سرگرمیاں طالب علمانہ زندگی سے باہر ہوتی تھیں لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ آج کا طالب علم معاشرے کے اجتماعی اخلاقی زوال کا حصہ بن گیا ہے۔ معاشرے کا رخ اور سمت جس جانب ہے طالب علم بھی اسی بہاؤ میں بہے جا رہا ہے۔ کالج ہی کیا تمام تعلیمی اداروں میں آج نہ صرف نشے کی لت پڑتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ طلباء گروپ طالب علموں کو منفی سرگرمیوں کی جانب مبذول کرانے کے لیے ہر دم مگن ہوتے ہیں۔ یہی نقشہ، یہی تصویر "حبس" کے اندر دکھائی گئی ہے۔ جہاں طلبہ کا ایک گروہ پڑھتا ہے اور نہ پڑھنے دیتا ہے۔ محمد الیاس نے ناول میں یہ تمام منفی سرگرمیاں دکھائی ہیں۔

محمد الیاس کے ناول میں کچھ ایسے کرداروں سے تعارف ہوتا ہے۔ جو دراصل اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ایک ایسا معاشرہ جہاں جہالت کا حد سے زیادہ رواج ہے۔ آج مشرقی معاشرہ ہو یا مغربی ہر طرح کی اخلاقی روحانی قدروں کا زوال معمول بن گیا ہے۔ محمد الیاس کے ناول "حبس" کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اب معاشرہ بے مثال اور بے نظیر معاشرہ اس حوالے سے نہیں کہلایا جا سکتا کہ جہاں اخلاقیات پنپ رہی ہوں، محمد الیاس نے اخلاقی قدروں کے زوال کے ضمن میں باپ کے کردار کو دکھایا ہے۔ باپ جو اولاد کے لیے ایک مضبوط سائبان ہوتا ہے۔ وہی جب اولاد کو خود برائی کی طرف دھکیلے تو ایسے میں معاشرے کے زوال آمادہ ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ سھودی کے دلدار عالم سے طلاق لینے پر اس کے باپ کا کردار دیکھئے۔

> "باپ کا جو گھناؤنا کردار سامنے آیا ہے، وہ ہضم نہیں ہو رہا۔ میں نے بتایا کہ دلدار سے طلاق لے چکی ہوں، چونکہ وہ سھودے کی طرح شادی کے قابل نہیں۔ قبلہ و کعبہ جناب والد صاحب دوجہان فرمانے لگے؛" کوئی طلاق ولاق نہیں ہوئی۔ دلدار کی یہ جرات۔ اور تحریری طلاق لینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ شوہر تمھارا، جب تک زندگی ہے، وہی رہے گا۔ مجھے ہر صورت میں اولاد چاہیے۔۔۔ دلدار کا علاج نہ ہو سکا، تب بھی اولاد ہو جائے گی۔ دنیا میں مرد مر نہیں گئے۔ جو بچے تم سے پیدا ہوں گے، وہ ہماری ہی اولاد ہو گی، نواسے نواسیاں۔۔۔ اول تو اللہ پاک صرف نواسے ہی دے گا، وہ بھی کم از کم آدھی درجن۔۔۔ تم فکر کیوں کرتی ہو؟ اب ہر بات کھول کے کیسے سمجھاؤں؟"[۳۸]

اخلاقی سطح پر انحطاط پذیر معاشرے کی گھٹن ہر آنے والے دن کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ فاضل ناول نگار اسی معاشرتی حبس کا ذکر کر رہے ہیں جو اس معاشرے کے ہر گلی کوچے میں بکھری پڑی ہے۔ یہاں ایک گھر میں پیدا ہونے والا بچہ اگر خواجہ سرا ہو تو والدین پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اسے اللہ رب العزت نے پیدا کیا ہوتا ہے۔ اس کے خواجہ سرا کے طور پر پیدا ہونے میں والدین کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ محمد الیاس جیسا ذہین اور معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھنے والا حکیم بھلا اس حوالے سے صرفِ نظر کیسے کر سکتا تھا۔ جب ایک معاشرہ بحیثیت مجموعی زوال آمادہ ہو اس کے ہر شعبے میں اس کی زندگی کے ہر میدان میں اخلاقی زوال شبانہ روز معمول بن جائے تو ایسے معاشرے کے اندر اس طرح کی منفی سرگرمیاں اچھنبے کی بات نہیں رہتی۔

ثریا ایک خواجہ سرا ہے۔ اس کا باپ شہر کا بڑا عہدیدار ہے۔ اس کی گھٹن زدہ معاشرے میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اپنے بچے کا راز آشکار کر سکے بلکہ وہ حیلے بہانے سے اس دایا کا قتل بھی کروا دیتا ہے۔ جو اس راز سے واقف ہو گئی تھی۔ یہ قتل مذہبی اور اخلاقی اقدار و رجحانات کے زوال کا آئینہ دار ہے۔ ثریا دایا کے قتل کا واقعہ یوں بیان کرتی ہے۔

> "بھائی کی پیدائش کے نو سال بعد اپنی آبائی حویلی میں پیدا ہوئی۔ دائی نے اماں کو بتایا کہ اللہ نے آسمان سے جنت کی حور کا بچہ بھیج دیا ہے، مگر وہ لڑکا ہے نہ لڑکی۔ اماں نے نے میرے ابا جان کو اندر بلا لیا اور روتے ہوئے دائی والی بات بتائی۔ ابا نے پتھر سے دائی کا سر پھوڑ دیا۔ سونے کے زیورات اور بہت سارے کرنسی نوٹ بوڑھی دائی کے لباس میں چھپا دیئے۔ اُس کو پیٹھ پر لادا اور گاؤں کے راستے پر لے جا کر گہری کھائی میں لڑھکا دیا۔"[۳۹]

محمد الیاس کی نظر سماج کے ہر طبقے کے ساتھ رکھے گئے نارو سلوک پر ہے۔ بالخصوص وہ ایسی برائیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ جن کو لوگ سماجی قدروں کی طرح اپنائے ہوئے ہیں، اور ان کو برائی نہیں سمجھتے، بلکہ خوبی سمجھتے ہیں۔ ایسا ہی رویہ خواجہ سراؤں کے ساتھ ہے۔ مصنف ایک خواجہ سرا ثریا کے کردار کے ذریعے یہ اجاگر کرتے ہیں کہ خواجہ سرا بھی جیتے جاگتے انسان ہیں۔ جن کے اندر دیگر انسانوں کی طرح احساسات و جذبات ہیں لیکن بد قسمتی سے یہ وہ مظلوم طبقہ ہے۔ جنھیں ان کے گھر والے قبول نہیں کرتے۔ جیسا کہ ثریا کا باپ اس کی شناخت چھپانا چاہتا ہے۔ گویا محمد الیاس یہ باور کرواتے ہیں کہ اس معاشرے میں مرد عورت سے جنسی تسکین

کے علاوہ کسی تیسری جنس کو قبول نہیں کرتا اور خواجہ سرا کو ایک الگ جنس کے طور پر موجود ہے۔ اسے مرد و عورت میں سے کسی ایک خانے میں خود کو زبردستی فٹ کرنا پڑے گا۔ وگرنہ اسے دھتکار دیا جائے گا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ثریا جیسے خواجہ سرا جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ وہ معاشرے کے کسی بھی فرد کے لیے ان سے ہمدردی ہونے کے باوجود ان کو ان کی شناخت کے ساتھ قبول کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ثریا جب دلدار عالم پر اپنی شناخت واضح کرتی ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف دلدار عالم کی بھی اسی دن، اسی وقت پر روح نکل جاتی ہے۔ گویا مصنف یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ سماج میں اس جنس کے ساتھ ایک مکمل فرد کی زندگی ممکن ہی نہیں رہی۔ ثریا کی حقیقت جاننے کے بعد دلدار عالم اپنے جذبات کو لفظوں کی شکل یوں دیتا ہے۔

> "میری جان روح کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ ہماری رُوحیں ازل سے جُڑی ہوئی ہیں۔ حقیقت کھلنے پر میری محبت، عشق سے بھی آگے ارفع مقام پر فائز ہو گئی ہے۔ دل میں رتی بھر ملال نہ لائیں۔۔۔ دمِ آخر قریب ہے۔ جاتے جاتے فانی دنیا میں کسی دور دراز مقام پر ایک ساتھ رہ لیں گے۔ جی بھر کے باتیں کریں۔"[۴۰]

اپنے آپ کو مذہبی بنیادوں پر استوار سماج کہنے والے معاشرے کی اخلاقی دیوالیہ پن کی اس سے بڑی مثال اور نہیں ہو سکتی۔ محمد الیاس نے اس معاشرے کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کر دی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں اخلاق کا سوالیہ نشان بن جانا ایک بہت بڑا حادثہ ہوتا ہے لیکن اس معاشرے کو اپنے اخلاقی دیوالیہ پن کا احساس تک نہیں ہے۔ شاید "حبس" معاشرے کو یہ بتانے میں کامیاب ہو جائے کہ وہ کتنا گر چکا ہے اور اسے اپنی اخلاقیات کو توانا بنانے کے لئے اور دنیا کے زندہ معاشروں میں شامل ہونے کے لئے کتنے زمانے درکار ہوں گے۔

د۔ سیاسی تغیر و تبدل کے نتیجے میں میں سماجی اقدار کا زوال

کسی بھی ملک میں سماج کو متوازن رکھنے کے لیے ایک اچھے سیاسی نظام کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ لیکن بس قسمتی سے سیاسی بالیدگی نہ ہونے اور پے در پے سیاسی تغیر و تبدل نے ہمارے ہاں انتظامی ڈھانچے کو ہمیشہ یا تو ناکارہ رکھا یا اسے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا۔ اس سیاسی کشمکش کے نتیجے میں لاقانونیت کی فضا پھیلی اور طاقت ور طبقے نے کمزور کا استحصال نچلی پیمانے سے لے کر حکومتی سطح تک کیا۔ اس استحصال کے پیچھے سماجی اقدار کا

زوال ہے جو مناسب احتساب نہ ہونے کی وجہ سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ ہر دور کے بدلتے سیاسی منظر نامے کے ساتھ ان مسائل کی کیفیات بھی بدلتی رہیں اور ان کے اظہار کے طریقے بھی بدلتے رہے۔ محمد الیاس نے مختلف سیاسی ادوار کے آئینے میں ہمیں سماج کی یہ تصویر بڑی حد تک واضح دکھائی ہے۔ پاکستان کے تناظر میں پہلی اور سب سے بڑی تبدیلی قیامِ پاکستان اور ہجرت ہے۔ یہ ایسا عہد ہے کہ جس میں برصغیر بالخصوص پاکستان کوئی سیاسی ڈھانچہ نہ رکھتا تھا۔ ایک نوزائیدہ مملکت میں قانون نافذ کرنے والے ادارے کہاں تک فعال ہوتے، لہٰذا ان کے ناول میں اس سیاسی تبدیلی میں فرد کے جنسی استحصال سے لے کر معاشی، اقتصادی اور سیاسی خلفشار تک سب نظر آتا ہے۔ کوئی بھی سماج اپنی سیاسی تشکیل کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی سطح پر ہونے والی تبدیلیاں معاشرے کو بہت سے مسائل سے دوچار کرتی ہیں۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ کو پاکستان دولخت ہو گیا۔ ہمارے بھائی ہم سے جدا ہو گئے تھے۔ ادھر ہم ادھر تم کا نعرہ بلند ہوا تھا۔ مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بن جانا، گویا ہمارے جسم کے اہم حصے کا ہمارے سے کٹ جانے کے مترادف تھا۔ یہ تاریخ پاکستان کا المناک حادثہ تھا۔ اسی سیاسی ابتری کے حوالے سے فیض نے کہا تھا:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد[۴۱]

ناصر کاظمی جیسے حساس شاعر نے بھی اسی سیاسی عدم استحکام کا نہ صرف اثر لیا بلکہ اس گھٹن زدہ ماحول میں اپنے بیانے کو بیان کیا۔ ناصر نے کہا:

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے
وہ صبح صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے
میں ان کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر
وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوئے
عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے
یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمین کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے [۴۲]

محمد الیاس بھی باقی ادیبوں کی مانند بہت حساس اور درد مند دل رکھنے والے نیز پاکستان کی سیاسی و معاشرتی اونچ نیچ کو سمجھنے والے ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ محمد الیاس پاکستان کیے سماجی زندگی سیاسی عروج وزوال اور معاشرے کی اونچ نیچ کو بہت قریب سے جانتے ہیں اور پھر اسے کاغذ پر منتقل کر دیتے ہیں۔ ایک اچھا ناول نگار سماج کی ان برائیوں کو بطور ناقد یا ناصح نہیں بیان کرتا بلکہ وہ خود اس سے متاثر کردار بن جاتا ہے۔ اور احساس کی صورت میں اس ساری صورتحال کے سماج پر اور فرد پر پڑنے والے اثرات کو اجاگر کرتا ہے۔ یہی چیز ادب کو تاریخ سے جدا کرتی ہے۔ تاریخ صرف واقعہ کا بیان ہے۔ اس کے برعکس ادب کسی بھی واقعے کے حقیقی اثرات کا بیان ہے۔ پاکستان کی درج بالا صورتحال سے کم و بیش سب واقف ہیں اور ان کو ایک طرح سے ملکی سطح کی سیاسی کشمکش گردانتے ہیں۔ لیکن محمد الیاس ایک حساس ادیب ہونے کے ناطے اس کشمکش کے سماج، فرد اور اسکی اخلاقی و نجی زندگی پر اس کے اثرات کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ وہ اس سیاسی خلفشار کی زائیدہ لاقانونیت اور بربریت کو سماج کے استحصال میں کارفرما دکھاتے ہوئے اس کے اسباب و محرکات کو بھی اضح کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ مصنف کے دل کا درد معلوم ہوتا ہے۔ اور پوری حسیت کے ساتھ وہ اپنا یہ درد اچھال دیتے ہیں۔ یہ درد جہاں افراد کے حوالے سے ہے وہیں اس کا دوسرا پہلو وطن اور اس کی سالمیت بھی ہے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کے قارئین آگاہ ہیں کہ محمد الیاس کے ہاں وطن کا درد کس درجہ پر پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل حیات لکھتے ہیں:

> "محمد الیاس ایک محب وطن انسان ہیں اور ان کے ناولوں میں یہ بات جابجا آشکار ہوتی ہے۔ وہ کسی کے ساتھ زیارتی ہوتے دیکھتے ہیں تو اس بات پر برملا احتجاج کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ظالم کتنا طاقت ور ہے۔ یہی بات ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں پولیس کے مظالم کے ساتھ ساتھ جنرل ضیا کی پالیسیوں اور بھٹو کی جاگیر دارانہ سوچ پر کھل کر تنقید کی ہے" [۴۳]

اس استحصال کے نظام اور سیاسی دنگل میں ہر صاحبِ اقتدار عوام سے جو پہلا حق چھینتا ہے وہ آزادی رائے کا ہے۔ جس کا سبب اپنی سیاہ کاریوں کو چھپانا اور عوام کو اپنے خلاف ہونے سے روکنا ہوتا ہے۔ یہ روش ایسے عہد میں نہ صرف حکومتی سطح پر ہوتی ہے بلکہ چھوٹے چھوٹے طاقتور گروہ وجود میں آجاتے ہیں جو ان سیاسی پناہوں سے فائدے اٹھاتے ہوئے لوگوں پر اپنی فکر مسلط کرتے ہوئے فکری آزادی کو سلب کرنے لگتے ہیں۔ "حبس" بھی ایک ایسا ہی ناول ہے۔ جس میں اندر پاکستانی معاشرے میں گرتی ہوئی سماجی قدروں اور آزادی رائے پر پابندیوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ناول کے آخری صفحات میں ایسے لگتا ہے کہ محمد الیاس ادیب کے بجائے صحافی کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ شاید انہوں نے یہ کردار اس لئے قبول کر لیا ہو کہ وہ ہر صورت میں عوام کو اور اپنے قارئین کو اس گھٹن اور حبس کے بارے میں بتانا چاہتے تھے۔ جس کو انہوں نے اپنے دل و دماغ اور روح پر محسوس کیا۔ اس حوالے سے جمیل حیات لکھتے ہیں۔

> "ناول میں بنگلہ دیش بننے بھٹو کو سزائے موت دینے مختلف جمہوری حکومتیں بننے نت نئی ایجادات ہونے اور ملک و قوم کے لئے کوئی بھی بھلائی کا کام نہ کرنے والے حکومتی نمائندوں کے چہروں سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے ناول کا ایک موضوع متشدد حسین مولوی بھی ہے جو بات بات پر کفر کے فتوے جاری کرتے ہیں اور معاشرے کو سدھارنے کی بجائے کاٹنے کا کام کرتے ہیں اس کی ایک مثال دلدار کا دوست بچہ ہے جو دہریہ ہے خدا کو نہیں مانتا اور متشدد لوگ اس کو قتل کر دیتے ہیں"[۴۴]

ناول میں پراچہ کے کردار سے ایسا لگتا ہے کہ وہ مذہب بیزار ہے لیکن یہ شخص آزادی رائے پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ وہ اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ شادی کی ذمہ داریوں سے مبرا ایک آزادانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اپنے دل کا احوال اپنی فکر کو کھلے بندوں بیان کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ کسی مذہبی شدت پسند تنظیم نے پراچہ کو قتل کر دیا ہے۔

> "پراچہ" کو لاہور اس کے فلیٹ میں کسی انتہا پسند تنظیم نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اُسی کے خون سے کمرے کی دیوار پر لکھے گئے چند الفاظ کا مفہوم بڑا واضح تھا کہ وہ اپنے خیالات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا تھا"[۴۵]

پراچہ آزادی رائے کو حق ماننے والا بالکل بے ضرر شخص تھا۔ اس سے کسی کو نقصان نہیں تھا نہ ہی وہ کسی کا نقصان چاہتا تھا۔ اس کی خواہش صرف یہ تھی کہ گھٹن اور حبس کم ہو جائے۔ لوگ جو سوچتے یا سمجھتے ہیں۔ اس کو بلا حیل و حجت اور بلا جھجک بیان بھی کر سکیں۔

جب کسی معاشرے میں اخلاقی قدروں کا حد سے زیادہ زوال آجائے۔ وہاں پر سیاسی اکھاڑ پچھاڑ روز کا معمول بن جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اس طرح کے بہیمانہ جرائم معمول بن جاتے ہیں۔ یہ کسی بھی معاشرے کے لیے لمحہ فکریہ سے کم نہیں ہے۔ اس سے رفتہ رفتہ گھٹن بڑھنے لگتی ہے۔ حبس کا راج ہونے لگتا ہے اور اخلاقیات کی دھجیاں اڑادی جاتی ہیں۔ یہی سب کچھ محمد الیاس پراچہ کی موت کے وقت دکھاتے ہیں کہ جب دلدار عالم وجی شاہ کو پراچہ کے قتل کے بارے میں افسوس سے بتاتا ہے تو وہ اس کے قتل پر افسردہ ہونے کے بجائے الٹا اسے ملامت کا نشانہ بناتا ہے:

> "کاش! وہ راہ راست پر آگیا ہوتا۔۔۔ بہر حال ہم اپنے مقتول دوست کے لیے فاتحہ بھی نہیں پڑھ سکتے کہ ایمان کی سلامتی عزیز ہے۔"[۴۶]

سماجی انحطاط اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اپنے عزیز دوست کی موت پر بھی سوگ منانا روا نہیں۔ کتنی گھٹن ہے۔ یہ سماجی اقدار اور اخلاقیات کا زوال ہے۔ "حبس" کے آخری صفحات بیان کر دیتے ہیں کہ یہ گھٹن کیوں پیدا ہو گئی تھی۔ اس حبس میں اضافہ کیوں ہو گیا تھا۔ فاضل ناول نگار بتاتے ہیں کہ مارشل لاء لگ گیا تھا۔ اس میں زبردستی نمازیں پڑھائی جارہی تھیں اور ان کی رپورٹ بھی مرتب کی جارہی تھی۔۔

> "سرکاری دفاتر میں ادائیگی نماز کے لیے باقاعدہ اہتمام کیا گیا اور رپورٹیں مرتب ہوتیں کہ کون سا اہل کار شعائرِ اسلامی کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھتا۔"[۴۷]

ملکی سیاسی صورتحال کی تصویر کشی میں ناول نگار نے سیدھے سادھے بیانیے سے کام لیا۔ ناول میں سیاسی شورش اور اس کے سماج پر اثرات کو کسی تہہ داری یا کرداروں کی مفلوک الحالی کے ذریعے احساس کی سطح پر نہیں جاگر کیا گیا۔ سیاست کے بارے میں اکثر بیانیے صحافتی یا غیر افسانوی نثر سے میل کھاتے ہیں۔ وہ واقعات کو کسی علامت یا کسی استعارتی بیان میں نہیں بیان کرتے بلکہ سپاٹ انداز میں اس ساری صورتحال کو بیان کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کریں۔

"ملک میں مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا اور سابقہ حکومتی سربراہ کو عدالتی فیصلے کے تحت جو سزائے موت سنائی گئی اس پر عمل درآمد بھی کر دیا گیا۔ حکومتِ وقت کی طرف سے کم و بیش ہر شعبہ زندگی میں بڑی سخت پالیسیاں نافذ ہونے سے گھٹن کا ماحول پیدا ہوا، جس کے نمایاں اثرات معاشرے پر بھی پڑے۔ جہاں زیر عتاب سیاسی قوتوں کی سرگرمیو ں پر پابندیاں لگیں وہاں حاکمِ وقت کی حمایت میں ابھرنے والے طبقات بہت طاقت ور ہو گئے۔"[۴۸]

اگرچہ سیاسی مسائل کا بیانیہ صاف اور صحافتی ہے لیکن یہ اس سیاسی منظر نامے کے کسی پہلو کو ترک نہیں کرتا۔ ناول نگار ہمیں بتاتا ہے کہ مارشل لاء کی سختی میں اخلاقیات منافقت کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ اخلاقیات اور مذہبی لبادے کا ملمع ہوتا ہے، لہذا اس کے مثبت کی بجائے منفی اثرات زیادہ ہوتے ہیں۔ ضیاء دور کے اسلامی قوانین حتیٰ کہ دفاتر اور سرکاری شعبوں میں نماز اور دینی روش میں کوتاہی کرنے والوں کی رپورٹین اور ان کے خلاف کاروئیاں ہونے لگیں۔ اس طرح لالچی اور طمع زادلوگ دینداروں کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ اس گھٹن زدہ ماحول نے داخلی اخلاقی حالت کو کمزور کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے میں بے رواہ روی اور مفارد پرستی نے نئی راہیں نکالیں اور معاشرہ ابتر ہونے لگا۔ اس ضمن میں مصنف اس دور میں اداروں کی انتظامی کیفیت کی عکاسی کچھ یوں کرتے ہیں۔

"معاشرے اور سرکاری اداروں کا ماحول یکسر بدلتا جارہا تھا اور نیا کلچر تشکیل پا گیا۔ رواداری، برداشت اور انسانی برادری میں روایتی ہم آہنگی کے جذبات بتدریج مفقود ہوتے گئے۔ نئے نئے تعصبات ابھر آئے جن کے بارے میں کبھی سوچا نہ تھا دفاتر میں بیش تر لوگ ساڑھے بارہ بجے ہی کام چھوڑ کر اپنی نشستوں سے غائب ہو جاتے اور چھٹی تک واپس نہ پلٹتے۔ جس کے بارے میں بھی پوچھا جاتا، معقول جواب ملتا کہ نماز کے لیے گئے ہیں۔"[۴۹]

یہ ابتری ملکی بالا انتظامیہ تک میں پھیل گئی اور بدعنوانی نے زور پکڑا۔ حکمرانوں نے اپنی ذاتی ملکیت بڑھانے کے لیے ملک کو قرضوں میں پھنسا دیا۔ اس ضمن میں مصنف بتاتے ہیں کہ کس طرح ملک بیرونی

قرضوں کی دلدل میں گردن تک دھنس گیا۔ نصف سے زائد آبادی خطِ غربت سے بھی نیچے ذلت آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کے برعکس درمیانے درجے کے حکومتی اہلکار بھی اتنا مال سمیٹ چکے کہ بیشتر کی اولادیں حصولِ تعلیم کی غرض سے ترقی یافتہ ممالک میں سکونت پذیر ہو گئیں۔ مصنف صرف اتنا ہی نہیں بتاتا بلکہ وہ اس ساری صورحال کو انتہائی قریب سے اور گہرائی سے دیکھتا ہے۔ ملک کے نام پر لیا گیا قرضہ کس طرح حکمرانوں کی جیب میں جاتا ہے کہ جب وہ حکومتی ملکیت ہے۔ تو مصنف ہمیں اس شاطرانہ روش سے بھی پردہ اٹھاتے نظر آتا ہے۔ وہ ان چالوں کی حقیقت بھی اجاگر کرتا ہے کہ جن کی مدد سے وہ باآسانی کسی مزاحمت یا کسی بھی پکڑ کے بغیر بدعنوانی کرتے ہیں۔ اس بدعنوانی کی ایک صورت مصنف یہ بتاتے ہیں۔

اس ضمن میں مصنف نے اختیارات کی تقسیم اور ان کے زور پر اقرباء پروری کی روش کو بھی اجاگر کیا۔ مصنف بتاتے ہیں کہ ایک سیاسی جماعت کے دورِ حکومت میں ملک کے وسائل کی اسی فیصد حصے سے صرف ۴۰ سے ۴۵ لاکھ من پسند لوگ مستفیض ہوتے ہیں۔ وہ دیگر تمام جرائم کے محرکات میں بڑا محرک اس سیاسی قوت کی مدد سے دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو گردانتے ہیں۔ یہ معاملہ صرف فرد کی زندگی کا نہیں بلکہ ناول ہمیں بتاتا ہے کہ اس محرومی کی وجہ سے پیدا ہونے والی مایوسی اور ناامیدی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سماج میں محروم طبقے میں سے ایسے گروہ وجود میں آجاتے ہیں جو ایسے قدامات کی طرف راغب ہو جاتے ہیں کہ جن کے سبب وطن کی سالمیت تک خطرے سے دوچار ہو جاتی ہے۔

ایسی صورتحال میں ایک اور پہلو جو مصنف نے اس سیاسی خلفشار کا بتایا وہ ان سیاسی لوگوں کا نوازا ہوا طبقہ چاہے وہ سرمایہ دار ہو یا انتظامی امور سے منسلک ہوں۔ اس خائن اور بدعنوان حکومت کا دوام چاہتے ہیں۔ لہذا اس حکومت نے ان اقدامات کے خلاف اٹھنے والی آوزوں کو بے رحمی سے کچل دیا جاتا ہے۔ یوں حکومتی مشینری اور طاقت کی مدد سے انقلاب کا رستہ بند کر دیا جاتا ہے۔ اس صورتحال میں ملک پستی کے سفر میں رہتا ہے۔ اس مسلسل ستم اور غربت کی وجہ سے بہت سے لوگ ملک دشمن قوتوں کا آلہ کار بن جاتے ہیں۔ یہ عمل کیسے وقوع پذیر ہوتا ہے اس کا بیان یوں کرتے ہیں۔

"اندھری نگری چوپٹ راج" کی عملی صورت ہم اپنی زندگی میں دیکھ رہے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک لوٹ مار کا ایسا بازار گرم ہوا کہ اس کے اثرات قریب قریب ہر شعبہ زندگی پر مرتب ہوئے۔ عام شہریوں کو آئین کی رو سے حاصل حقوق صرف کتابوں میں ہی لکھے رہ گئے۔ حکومتی اہل کار تاجر اور مراعات یافتہ طبقات بے خوف و خطر عوام کو لوٹنے لگے۔ ہر شعبہ میں کارٹل بن گئے۔ لینڈ مافیاز نے مفلوک الحال عوام کو ان کی عمر بھر کی بچتوں سے محروم کر دیا۔ بے روزگاری عام ہو گئی۔ روزی کی تلاش میں بیرونِ ملک جانے پر مجبور نوجوان، جرائم پیشہ انسانی سمگلروں کا آسان شکار بننے لگے۔ ہر قسم کا قانونی دھندہ کرنے والوں نے کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ مضبوط بنیادوں پر وابستگی قائم کر رکھی تھی۔ حکومتی ادارے جہاں اربوں روپے کے فراڈ میں شراکت دار ہوتے وہاں نچلی سطح پر تیسرے درجے کی جسم فروشی عورت کی خرچی میں بھی حصہ بٹور لیتے۔"[۵۰]

ایسا کسی ایک حکومت میں نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ملک میں ایسی روش بن چکی ہے کہ جو بھی حکومت آتی ہے اس کو آلہ کار میسر ہوتے ہیں۔ یہ ایک تسلسل ہے۔ ملک کو لوٹنے والے بدلتے رہتے ہیں لیکن لوٹنے کی روش وہی رہتی ہے۔ جب حکومتیں بدعنوان ہوں تو یہ سلسلہ سے وپر سے نیچے تک آتا ہے اور نتیجتاً سماج مکمل طور پر اس المیے سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ بدعنوانی ظلم و ستم اور مطلب پرستی ہمیں سماجی میں کثرت میں نظر آتی ہے۔ سماجی اقدار کا خون ہو جاتا ہے اور ہر شخص اس نظام کے رنگ میں کچھ یوں رنگ جاتا ہے کہ کوئی بھی بد عنوانی کو عیب نہیں سمجھتا۔ اسی تسلسل کو وہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

"تیس پنتیس برسوں پر محیط عرصے میں کئی حکومتیں بنیں مگر طرزِ حکمرانی کم و بیش ایک سا رہا۔ زیادہ تر حکمران بدعنوان ہی نہیں ،نااہل بھی ثابت ہوئے۔ جس کے اثرات نچلی سطح کی مقامی حکومتوں تک سرائیت کر گئے۔ گویا اعلیٰ درجے کا پروٹوکول اور زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی غرض تھی۔ قومی خزانے سے غبن اور بیرونی سودوں میں اربوں کا کمیشن حاصل کر کے بیرونِ ملک جائیدادیں بنانے کا چلن عام ہو

گیا۔ ستم بالائے ستم، ادنیٰ سے اعلیٰ سرکاری عہدے داروں کی اکثریت بھی کرپشن کی بہتی گنگا سے مقدور بھر مستفید ہونے لگی۔ حصہ بقدر جُثہ وصول کرنے میں کسی نے کسر نہ چھوڑی۔ چلو سے بالٹی اور بالٹی سے ٹینکر تک، جتنا جس کا بس چلا۔ بھر لیا۔ بڑوں نے راجباہ اور نہریں نکال لیں۔"[۵۱]

ایسے عناصر جنھوں نے آزادی اظہار رائے پر قدغن عائد کی۔ معاشرے میں ظلم و ستم روا رکھا۔ اسلام کے نام پر وطن کا استحصال کیا۔ ایسے عناصر فاضل ناول نگار کی زد پر رہے۔ ایک منتخب وزیر اعظم کو تختہ دار پر لٹکایا۔ ان کے چاہنے والوں پر زندگی تنگ کر دی اور کوڑے برسائے۔ چنانچہ اس گھٹن اور حبس کے نتیجے میں سماجی اور اخلاقی قدروں کا زوال اپنی منتہا کو پہنچا۔

ناول کا مطالعہ کرنے سے یہ بات پتا چلتی ہے کہ محمد الیاس کو اس بات کا دکھ ہے کہ سماجی قدریں کیونکر رُوبہ زوال ہے۔ سماج ایسے راستے پر کیوں چل پڑا ہے جس کی منزل گمراہی کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اس ناول کا مطالعہ ہماری سیاسی تاریخ میں بیسویں صدی کی ساتویں، آٹھویں اور نویں دہائی میں ہونے والی تبدیلیوں کا اظہار کرتا ہے۔ ایک نئے ریختہ معاشرے کی تعمیر کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"عوام اکائیوں میں بٹ گئے۔ نسلی، لسانی۔ علاقائی، مذہبی، مسلکی اور ذات برادری کی ادنیٰ ترین تفریق نے معاشرے کی بافت کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ برداشت اور رواداری قصہ پارینہ ہو کر رہ گئی۔۔۔ زمانہ ایسا بدلا کہ انسان ہی انسان کا دشمن ہو گیا۔ ایسی ایسی عصبیتیں اور نفرتیں اُبھر آئیں، جن کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ انتہا پسند طبقات باقاعدہ ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئے۔ عسکری تنظیمیں قائم کر لی گئیں، جو مخالف نظریات اور عقائد رکھنے والوں پر حملہ آور ہوتیں۔ دہشت گردی کی وارداتیں روزمرہ کا معمول بن گئیں۔ عام نہتے شہری عبادت گاہوں اور عوامی مقامات پر نشانہ بننے لگے۔ سرکاری نجی اداروں اور گلی محلوں میں، کہیں بھی امن و سکون نہ رہا۔"[۵۲]

لسانی تقسیم کلاشنکوف کلچر نشے کی لعنت ایسی سماجی برائیاں تھیں جو اس سے پہلے پاکستانی سماج میں یا تو موجود نہیں تھی یا ان کی موجودگی بہت کم درجے پر تھی۔ افغان جہاد کے دوران پاکستان کے چوک چوراہے میں پاکستانی تنظیموں کا پروپیگنڈا کیا گیا اور مہاجرین کی آڑ میں مذہبی شدت پسندی بہت بڑھ گئی۔ اس کا نتیجہ برآمد ہوا اس کے بارے میں گزشتہ تین دہائیوں میں جو واقعات وحادثات اور سانحات رونما ہوئے۔ اس

مذہبی شدت پسندی کے نتیجے میں پاکستان کو ستر ہزار لوگوں کی جانیں قربان کرنی پڑیں اور کئی بلین ڈالرز برباد ہوئے۔ ان سماجی قدروں کے زوال کا آغاز کب ہوا تھا۔ اس سماجی انحطاط کا بیج کب بویا گیا تھا۔ محمد الیاس کا ناول پڑھ کر اس کی بہت سی گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اور پھر پتہ چل جاتا ہے کہ پراچہ کا قتل کیوں ہوا تھا اور ہم گزشتہ تین دہائیوں سے سماجی انحطاط پذیری کی اتھاہ گہرائیوں میں جا پڑے ہیں اس تمام تر کا اندازہ ناول کی ان سطروں کو پڑھ کر ہو جاتا ہے جو محمد الیاس نے مذکورہ بالا دہائیوں کے بارے میں تحریر کر دیا ہے کبھی کبھی لگتا ہے کہ ان اقتباسات میں محمد الیاس ادیب سے بڑھ کر پروپیگنڈہ بن گئے ہیں اور اس کی کڑیاں ترقی پسند تحریک کے ادب سے جا ملتی ہیں جو بہت سے ترقی پسندوں نے لکھا جو ترقی پسندوں سے بڑھ کر نعرے اپلنے کا ادب بن گیا تھا۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جب گھٹن بڑھ جائے سماجی قدروں کا زوال بہت زیادہ ہو جائے تو ادیب بھی نعرے اپلنا شروع کر دیتا ہے۔ حبس اور گھٹن بہت بڑھ گیا اور سماجی قدروں کا زوال اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ انہیں صحافیانہ ادب لکھنا پڑ گیا یہ اقتباسات اس بات کے غماز ہیں کہ تخلیق کار کس قدر درد دل مند رکھتا ہے۔ وہ معاشرے کا کتنا بڑا نباض ہے اس نے بہت خوبصورت تشخیص کر دی ہے تخلیق کار ہمیں بتا رہا ہے کہ سماجی قدروں کے زوال کے زمانے کب شروع ہوئے اور ان میں عروج کا آیا۔

محمد الیاس کے ناول "حبس" کے مفاہیم اور معنی ان اوراق کو پڑھ کر اور بھی زیادہ مترشح ہو جاتے ہیں شاید اسی لیے انہوں نے اس ناول کا عنوان "حبس" تخلیق کیا تھا اخلاقی قدروں کا زوال سماجی قدروں کا زوال یہ بہت بڑا سانحہ ہوا ہے پاکستانی معاشرے میں۔ ناول نگار کے خیال میں اس کی بڑی وجہ پاکستان کی طرح ۳۷ سالہ تاریخ میں تیزی سے رونما ہونے والا تغیر تبدل ہے پھر اس کی وجہ ایک منتخب وزیر اعظم کا قتل ہے اور اس کے نتیجے میں عوام کا استحصال بہت بڑھ گیا۔ اس کے ثمرات بہت بھیانک بر آمد ہوئے۔ سماجی قدروں کا زوال پاکستانی معاشرے کو کہاں سے کہاں لے گیا دولتمندی کی دوڑ میں سبھی شامل ہو گئے۔ مذہب ادب واحترام گمشدہ زمانوں کی کڑیاں بن گئے۔ دولت، سیاست شہرت ایمان ٹھہر گئے۔ یوں پاکستانی سماج کا رنگ روپ بدل کیا اور سماج تغیر و تبدل کے نتیجے میں کس قدر تبدیل ہوا کہ اس کی پہچان مشکل ہو گی۔

انیس سو سینتالیس اور اس کے پہلے کئی دہائیوں کو ذہن میں رکھیں تو اسلامی جمہوریہ پاکستان بنانے کے لئے لوگوں نے ہجرتیں اختیار کی تھی اور گھر بار مال دولت جائیداد لٹائی تھی۔ کئی بیٹیوں کی عصمتیں قربان کی تھی وہ خواب جن کی تعبیر عذاب کی صورت میں بر آمد ہوئیں جن لوگوں نے دیکھے وہ کیا ہوئے۔ جس کی تصویر ناصر دکھاتے ہیں:

ع۔ شہر در شہر گھر جلائے گئے [۵۳]

یہ دکھ سمیٹے وہ لوگ اس لیے پاکستان میں وارد ہوئے تھے کہ وہ ایک عظیم الشان مملکت بنائیں گے یہاں کا سماج بڑا پاوتر ہو گا۔ خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کا ایک کردار چھمی مجبوری میں پاکستان نہیں اسکیں تو وہ اپنی کزن عالیہ کو خط لکھتی ہے:

"تمہیں پاکستان جانا مبارک ہو۔ جب اس پاک سرزمین پر پہنچے تو اس سے میری طرف
سے چومنا وہاں کی خاک مجھے ارسال کر دینا کہ میں اسے اپنی مانگ میں سجاؤں گی۔" [۵۴]

محمد الیاس تاریخ کو سمجھتے ہیں انہوں نے یہ سارا سفر طے کیا ہے اس لیے انہوں نے اخلاقی اور سماجی قدروں کے زوال کو زیادہ قریب سے محسوس کیا ہے زیادہ دل دردمند سے سمجھا ہے اور اس کی تشخیص کر دی ہے۔ "حبس" میں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو محمد الیاس نے مذہبی، سماجی، اخلاقی اور سیاسی حوالے سے جن جن سماجی برائیوں کو موضوع بنایا ہے ان میں دو طرح کے رویے ملتے ہیں۔ ایک داخلی طور پر فرد کی اخلاقی تنزلی اور دوسرا خارجی طور پر نظام کی خرابیاں۔ ہم عصر سماجی تناظر میں ان کے بیان کردہ مسائل اور ان کی وجوہات حقیقی زندگی سے جڑی ہوئی ہیں۔ کوئی بھی کردار یا سماجی رویہ ان کے تخیل سے نہیں وجود پاتا بلکہ ہمارے سماج سے ابھرتا ہے اور پھر اس کے محرکات واضح طور پر ہمارے سامنے کھلتے جاتے ہیں۔ ناول نگار کی سماج شناسی اور عصری مسائل کے پیشِ نظر سماج کی تفہیم و تشریح ان کے سماجی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اگرچہ "کہر" میں ان مسائل کو زیادہ وسعت سے بیان کیا گیا ہے، لیکن وہ وسعت زیادہ تر خارجی محرکات کو موضوعِ بحث بنانے کی وجہ سے ہے۔ جس میں خارجی وجوہات مفصل ہونے کی بجائے ان کے زیر اثر داخلی تبدیلیوں کو زیادہ وسعت سے بیان کیا گیا اور اس داخلی کیفیت کے نتیجے میں خارج میں اس کے اظہار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دونوں ناول اگر ایک ساتھ پڑھے جائیں تو ہمارے سماج کا ایک مکمل عکس ہمارے سامنے ابھرتا ہے جو خارجی اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے باطنی محرکات میں بھی قاری پر کھلتا چلا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد الیاس، "حبس" سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۲۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۳۰

۳۔ ایضاً۔ ص ۳۱۰ تا ۳۱۱

۴۔ ایضاً، ص ۲۷۷

۵۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۶۔ ایضاً، ص ۳۳۸ تا ۳۳۹

۷۔ ایضاً، ص ۳۶۹

۸۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۹۔ ایضاً، ص ۵۳ تا ۵۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۱۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۱۳۔ ایضاً، ۲۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۶۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۶۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۶۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۶۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۳۶

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۴۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۲۴۔ ایضاً، ۱۵۲

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۲۶۔ علی عباس جلالپوری، رسوم اقوام، تخلیقات، لاہور، ۱۰ اگست ۲۰۰۰، ص ۱۳۵

۲۷۔ محمد الیاس، حبس، ص ۱۹۱

۲۸۔ ایضاً، ۱۹۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۵۶ تا ۱۵۷

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۳۲۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص

۳۳۔ محمد الیاس، حبس، ص ۲۷۵

۳۴۔ انٹرویو بالمشافہ، محمد الیاس، بحریہ ٹاؤن فیز ۲، راولپنڈی، ۱۰ جون ۲۰۲۰ء

۳۵۔ محمد الیاس، حبس، ص ۲۳۴

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۹۶

۳۷۔ ایضاً، ص ۴۳۰

۳۸۔ ایضاً، ص ۲۴۰

۳۹۔ ایضاً، ص ۴۶۴

۴۰۔ ایضاً، ص ۴۶۵

۴۱۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۵۳۸

۴۲۔ ناصر کاظمی، دیوان، اسلام پورہ لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۸

۴۳۔ جمیل حیات، ڈاکٹر، محمد الیاس کے ناولوں میں مزاحمت کے جلوہ ہائے رنگ، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ نمبر ۱۲۴، ۱۲۳، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۲۰۲۰ء، ص ۱۴۷

۴۴۔ جمیل حیات، ڈاکٹر، حبس: ناسٹلجیائی کرب کا اظہاریہ، مشمولہ: سہ ماہی دھنک رنگ، فتح جنگ، ۲۰۲۰ء، ص ۸۲

۴۵۔ محمد الیاس، حبس، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۹۰

۴۶۔ ایضاً ۳۹۱

۴۷۔ ایضاً، ص ۳۷۴

۴۸۔ ایضاً، ص ۳۷۴

۴۹۔ ایضاً، ص ۳۷۴

۵۰۔ ایضاً، ص ۳۹۹

۵۱۔ ایضاً، ص ۳۹۸

۵۲۔ ایضاً، ص ۳۹۰

۵۳۔ ناصر کاظمی، کلیاتِ ناصر، فضل حق پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۴۵

۵۴۔ خدیجہ مستور، آنگن، نئی دہلی ۱۹۹۸ء، ص ۳۱۳

باب چہارم

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ

سماجی تعلقات کا وہ نظام جس کے ذریعہ ہم زندگی گزارتے ہیں معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے ایک سماج مختلف انسانی تعلقات کا مجموعہ ہوتا ہے یہ تعلقات اپنی نوعیت میں متنوع ہوتے ہیں جیسے معاشرتی اخلاقی روحانی تہذیبی ثقافتی اور سیاسی تعلقات وغیرہ تعلقات کا یہ تنوع بنیادی طور پر ان اکائیوں کی وجہ سے ہے جن سے ایک سماج تشکیل پاتا ہے جتنا فرق سماج کے تشکیلی عناصر میں ہوگا اتنا ہی فرق ہمارے سماجی رویوں میں نظر آئے گا۔ اگرچہ ہر سماج اپنی تشکیل میں جداگانہ عناصر پر مشتمل ہو سکتا ہے لیکن کچھ بنیادی عناصر ایسے ہیں جو کہ ہر سماج کی تشکیل میں لازمی حصہ دار ہوتے ہیں۔ سماج کی تشکیل میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ ان میں مذہب، قوم، جغرافیائی حالات، سماجی اور سیاسی حالات اہم ہوتے ہیں۔

ایک معیاری سماج عناصر کے توازن کا نام ہے ایسی تمام اقدار جو کسی سماج کو توازن میں رکھتی ہیں اعلی سماجی اقدار کہلاتی ہیں۔ وہ تمام اقدار جو معاشرے میں عدم توازن اور انتشار کو فروغ دیں سماجی برائیاں کہلاتی ہیں۔ سماجی برائیوں کا تعین مختلف سماجی حوالوں سے سماجوں کے اختلاف کے پیش نظر جدا جدا ہوتا ہے۔ ممکن ہے ایک عمل کسی سماج کے لئے قابل قبول ہو لیکن دوسرے سماج میں اس کی اجازت نہ ہو۔ یہ تمام عوامل سماج کے تشکیلی عناصر پر انحصار کرتے ہیں۔ سماج کے تعلقات کی نوعیت بھی اس کے تعین پر اثرانداز ہوتی ہے اور بعض سماجی برائیاں آفاقی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ انہیں بنیادی اخلاقیات کہا جاسکتا ہے جب معاشرہ اخلاقیات اور سماجی اقدار سے پستی کی طرف جانے لگے تو معاشرہ کی شکست وریخت کا آغاز ہوتا ہے۔ ادب سماج کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ ادب اور سماج ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں ادب ہمیشہ سے سماج کا ترجمان رہا ہے۔ سماج کی حقیقت اوراس کی تاریخ ادب کی صورت میں آئندہ زمانوں کے لئے محفوظ ہو جاتی ہے۔ جس میں سماج اور ادب دونوں کی بقا کا عنصر شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی عمل میں سماجی شعور بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور کوئی بھی تخلیق کار سماجی شعور سے لاتعلق ہو کر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ ادب ہمارے تہذیب وتمدن کا آئینہ ہے ۔ جیسے ہماری زندگی کے حالات ہوں گے ایسا ہی ادب ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب کو سماج سے کسی بھی طرح

الگ نہیں کیا جاسکتا اگر کسی فن پارے میں عصری رجحانات اور وقتی مسائل کا عکس نہیں ہو گا تو وہ ادب دیر پا نہ ہو گا۔

سماج واقعات کی سفر سے گزرتا ہے اس سفر میں ہونے والی تبدیلیاں ادب اوراورادیب دونوں کو متاثر کرتی ہیں تہذیبوں اور تمدنی قدروں کے بدلنے سے رجحانات اور تصورات بدلنے لگتے ہیں ادیب سماج کے عدم توازن اوراس میں پیدا ہونے والی خرابیوں کو محسوس کرتا ہے جہاں ان برائیوں کو اجاگر کرتا ہے وہیں سماج کی قوتوں کو مثبت سمت میں ابھارتے ہوئے سماج کو توازن کی طرف گامزن کرنے میں اپنا حصہ ڈالتا ہے۔ اردو ناول کا آغاز نو آبادیاتی دور کے استحکام کے بعد ہوا۔ یہ عہد آشوب کا عہد ہے ایک مکمل تہذیب اپنی شناخت کھو رہی تھی۔ نئی اقدار بنارہی تھی ۔لہذا اس عہد کے ناول نے بدلتی ہوئی اقدار کو محسوس کرتے ہوئے سماجی شعور کو بیدار کرنے کا سفر جاری رکھا یہ عہد مذہب سیاست اور معاشرت کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت ہر حوالے سے انقلاب کا عہد تھا۔ سماج کی تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی اس صورتحال میں سماجی اقدار کا انہدام سماجی برائیوں کا بننا اوران سب میں اہم سماجی اقدار کے معیار کے بدلتے ہوئے پیمانے ناول کا موضوع رہے ہیں

آغاز میں اردو ناول کا دائرہ اخلاقی مذہبی معاشرتی اصلاح سے متعلق موضوع تک محدود تھا لیکن رفتہ رفتہ سماجی معاشرتی سیاسی اور تہذیبی موضوعات کو بیان کیا جانے لگا۔ جب ادب برائے زندگی کا رجحان پڑا تو ایک صنف کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا زندگی سے براہ راست تعلق ہوں اس لیے ناول وجود میں آیا۔ ناول کی ابتدا کے اسباب جو بھی ہوں۔ لیکن اس کا تعلق سماج اور فرد سے گہرا ہے۔ گویا ناول ایک ایسا نثری ادب پارہ ہے جو پوری طرح انسانی زندگی کی عکاسی کرتا ہے نیز اس کی تعبیر تفسیر اور ترجمانی کرتا ہے کیونکہ ناول کا موضوع انسانی زندگی ہے لہذا یہ واحد صنف ادب ہے۔ جس میں مکمل زندگی کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ناول نگار اپنا مکمل نظریہ بھی بیان کرتا ہے جو نہ صرف قاری کو متاثر کرتا ہے بلکہ اس کے شعور کو بھی متحرک کرتا ہے۔

ابتدائی دور کی ناول نگاری مغرب کی نو آبادیاتی فکر کے خلاف مزاحمت اصلاح پسندی اور جدوجہد آزادپر محیط ہے۔ اس عہد میں جو ناول تخلیق کیے گئے وہ مکمل طور پر سماج اور زندگی سے ہم آہنگ تھے اس دور کے بیشتر ناولوں میں معاشرتی اور سماجی مسئلے کو موضوع بنایا گیا۔ ان سماجی موضوعات کو بنیاد بنا کر معاشرے پر تنقید کی گئی نیز اصلاح پسندی اور معاشرتی تصویر کا رجحان نمایاں تھا۔ منشی پریم چند نے حقیقت نگاری کے لئے جو راہیں ہموار کی تھی اس پر ترقی پسندوں نے اپنے موضوعات کی بنیادیں رکھیں۔ اس عہد میں تخلیق کردہ

ناولوں میں روایت سے انحراف اورآگے بڑھنے کے اشارے ملتے ہیں ان ناول نگاروں نے فرداور سماج کے بدلتے ہوئے رشتوں کو سمجھتے ہوئے سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ انفرادی مسائل کوزیر بحث لایا۔ تقسیم ہند کے بعد لکھے گئے ناولوں کے موضوعات فسادات ہجرت جلاوطنی میں سماجی اقدار کی شکست وریخت اور تہذیبی زوال وغیرہ تھے یوں کاسفر آگے بڑھتا گیا۔ یااس سفر نے اردو نثر نگاری کی روایت اوررجحانات کے تعین میں اہم کردارادا کیا۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے ساتھ ناول کے موضوعات میں وسعت آگئی۔ ادباوشعرانے اس سانحے کے متعلق لکھاتاہم ان ناولوں کارجحان سیاسی ومعاشرتی ہی رہابیسویں صدی کی آٹھویں دہائی سے ناول میں جدید عہد کا آغاز ہوا ناولوں میں جدید تجربات کیے گئے نیز حقیقت نگاری سے لے کر تاریخی سیاسی سماجی معاشی معاشرتی تہذیبی اور نفسیاتی جنسی رجحان کو اپنایا گیا اکیسویں صدی میں ناول کی روایت کو مضبوط بنیاد فراہم ہوئی۔ اس صدی میں جن ناول نگاروں کے ہاں سماجی شعور نمایاں طور پر نظر آتا ہے ان میں ایک معتبر حوالہ محمد الیاس ہے۔ وہ اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں الگ شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے تخلیقی سفر میں مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے، تاہم ان کی پہچان افسانہ نگاری اور ناول نگاری ہے۔ ان کے اب تک چودہ افسانوی مجموعے اور چھ ناول شائع ہو چکے ہیں۔ محمد الیاس کے قلم نے سماج سے وابستہ ہر موضوع پر قلم اٹھایاہے اور عصری مسائل کا تجزیہ بھی کیاہے۔ ان کے ناولوں کے موضوعات میں جاگیر دارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ ،تعصبات،توہم پرستی ،معاصر تاریخ وغیرہ شامل ہیں۔ "کُہر" کاموضوع ہی توہم پرستی ہے۔ ناول میں مذہبی ومعاشرتی منافرت کو نمایاں کیاہے اورد کھایاہے کہ کس طرح معاشرے میں پھیلی ہوئی افراتفری اور خودغرضی انسانی قدروں کو پامال کرتی ہے۔ جیساکہ ناول کا مرکزی کردارکرم ذوالقرنین اندرونی کرب اور بے چینی کا شکارہے۔ جس کی وجہ اس کے والدین کی خودغرضی ہے۔ انھوں نے "کُہر" اور "حبس" میں سماج کے ایک ایسے طبقے کے دکھ اوردرد کو بیان کیاہے جسے تعصب اور تنگ نظری نے ہمیشہ دبائے رکھا۔ فاضل ناول نگارنے سماج کے کمزور اور بے بس لوگوں کی مجبوری اور لاچاری کا ایسا منظر پیش کیاہے۔ جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

دونوں ناولوں کو الگ الگ دیکھا جائے تو موضوعاتی اعتبار سے دونوں ہی سماجی مسائل کو موضوع بناتے ہیں، لیکن "کُہر" میں وسعت ہے اور اس میں سماج کے تمام پہلوؤں کو ایک وسیع تناظر میں دکھایا گیاہے۔ سماج میں مختلف طبقات ونظریات کے جتنے خارجی مظاہر تھے سب موضوع بحث آئے۔ مذہبی حوالے سے دیکھا جائے تو

"کہر" میں مذہب کی معاشرے میں گہری عملداری کو سماج کے ہر طبقے کے طرز زندگی میں دکھایا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مذہب کے مثبت استعمال اور اس کی رحمت وعافیت دکھاتے ہوئے اس کی معکوس صورت یعنی مذہب کے ذریعے استحصال کو پیش کیا گیا ہے۔ مذہب کے مثبت رویوں کے طور پر انہوں نے ایک عام فرد سے لے کر ایک مذہبی رہنما تک کہ مثبت عمل کو معاشرے کی تعمیر وترقی کا سبب دکھایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے سماج میں مذہب ناشناسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مذہب کے نام پر لوگوں کے استحصال کو بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں بین المذاہب اور بین المسالک ہم آہنگی کو بھی بڑی عمدگی کے ساتھ موضوع بنایا گیا اور دکھایا گیا ہے کہ کیسے یہ تعصبات معاشرے میں تخریب کا سبب بنتے ہیں۔ ان تعصبات سے دوری معاشرے میں میں توازن پیدا کرتی ہے۔ دوسرا اہم پہلو سماجی بندشوں اور طبقاتی تقسیم کے سبب معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل ہیں۔ "کُہر" میں یہ مسائل اپنی تمام تر ترشی و تلخی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں، اور ان کے نتیجے میں جنم لینے والے مسائل کو بڑی عمدگی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ سماج میں ان مسائل کی حقیقی صورتحال اور اس کے محرکات کی نقاب کشائی اس ناول کو مصنف کے سماجی شعور کا ایک عمدہ مرقع بنا دیتی ہے۔ فرد اور سماج کی چھوٹی اکائیوں کے روابط سے بڑھ کر بڑے پیمانے پر سیاسی تغیر و تبدل کو جنم دیتا ہے۔ یہ بھی پاکستان کے تناظر میں عہد بہ عہد اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ ناول میں اجاگر کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر "کُہر" عصری مسائل اور سماجی صورتحال کی ایک مکمل پیشکش ہے جو ادیب کی ذمہ دارانہ حیثیت پر پورا اترتی ہے۔ سماج کی پیشکش تنقیدِ حیات کا فریضہ اس ناول میں بخوبی نبھاتے ہوئے محمد الیاس نے ہم عصر ناولوں میں سماجی شعور کے حوالے سے ایک معیاری نمونہ پیش کیا ہے جو لائقِ تحسین کی بھی ہے اور لائق تقلید بھی ہے۔

اگرچہ "حبس" کے موضوعات "کُہر" کے موضوعات سے مختلف نہیں ہیں لیکن ہمیں یہاں "کُہر" جیسی مفصل خارجی صورت نظر نہیں آتی، بلکہ مسائل کے خارجی محرک کو مختصراً پیش کرتے ہوئے مصنف اس کے داخلی اثرات کو زیادہ گہرائی سے بیان کرتا ہے۔ ارتقائی حوالے سے دیکھا جائے تو اس ناول کا تجزیہ اس نتیجے

پر پہنچاتا ہے کہ مصنف سے جو پہلو "کہر" میں تشنہ رہ گئے تھے انہی کو زیادہ گہرائی سے بیان کیا ہے۔ یہ گہرائی خارجی حالات کے تناظر میں داخلی تبدیلی کو زیادہ اجاگر کرنے کے حوالے سے ہے۔ "کُہر" کی "حبس" کے کردار بھی زندگی کے تمام طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ "حبس" میں ہر حوالے سے ان پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جنہوں نے انسان کو داخلی طور پر اخلاقی گراوٹ کا شکار کیا۔ مذہبی حوالے سے مختلف سماجی ضرورتوں اور داخلی پیچیدگیوں کے پیشِ نظر توہم پرستی کا رواج ہونا، اس کے علاوہ جنسی بے راہ روی کے لئے مختلف رسائل اور مختلف ذرائع کا تحریک کا سبب بننا اس کی مثال ہے۔ اسی طرح ایک طرف تعلیم اور دوسری طرف سماجی پابندیاں جب تصادم کی صورتحال اختیار کرتی ہیں تو اس کے نتیجے میں داخلی طور پر اخلاقی اقدار کی موت "حبس" کا موضوع ہے۔ سیاسی خلفشار اور احتساب کا نہ ہونا نفسانی خواہشات کی موجودگی میں اس طرح افراد کو قلبی طور پر سفاک بنا دیتا ہے۔ "حبس" اس کی عمدہ مثال ہے۔

مجموعی طور پر "کُہر" اور "حبس" دونوں اس سماج کی حقیقی پیش کش اور اس کی درست تفہیم کے پیش نظر مصنف کے سماجی شعور کے آئینہ دار ہیں۔ جن میں مصنف نے سماجی برائیوں کو اجاگر کرتے ہوئے سماجی اقدار کی پیشکش کو بھی مسلسل اپنائے رکھا۔ یعنی یہ سماج کی تنقید و تعمیر دونوں کا بہترین موقع ہے۔ یوں اپنے عصر سے مکمل طور پر پیوست اور حقیقی ناول ہیں۔

ب۔ نتائج

تحقیقی سوالات کے درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں۔

پاکستانی معاشرے میں بالخصوص اور برصغیر کے معاشروں میں بالعموم انسان ظاہر و باطن میں تفریق کا شکار ہے جب تک ظاہر و باطن میں تفاوت نہیں ختم ہو گا۔ اس وقت تک مضبوط معاشرے کی بنیاد ممکن نہیں پاکستان کے اندر نیز دنیا بھر میں تعصبات کی بنیاد پر انسانوں سے غیر مساوی سلوک قابلِ مذمت ہے۔ مذہب اور توہم پرستی میں حدِ فاصل قائم کر کے اس کی تفہیم کی جائے۔ توہم پرستی کی بیخ کنی از حد ضروری ہے۔ معاشرے کے اندر عدم برداشت کے رویے بڑھ رہے ہیں۔ جن کی فکر کرنی چاہیئے۔

محمد الیاس کے ناولوں میں سماج اور سماجی مسائل کے پسِ منظر میں جو رویئے کار فرما ہیں۔ ان میں جاگیر دارانہ نظام اور اس کے متعلقات ہیں۔ جنھوں نے معاشرے کے رنگ وروپ کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ توہم پرستی اور اس کے نتیجے میں نام نہاد پیری مریدی کا نظام اور اس کے متعلقات ہیں۔ جس کی وجہ سے مذہب کی درست تفہیم نہ ہونا بہت سے مسائل کی جڑ بن گئی ہے۔ نیز مذہب کی ظاہری نمود و نمائش کی وجہ سے اعلیٰ سماجی اقدار روبہ زوال ہیں۔ جس کی وجہ سے اخلاقی اقدار کی پامالی ہو رہی ہیں اور معاشرہ کھوکھلے پن کا شکار ہو گیا ہے۔

محمد الیاس کے ناول "کُہر" اور "حبس" کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے ناولوں میں عصری مسائل اور سماجی شعور نیز ان کے محرکات کو کہانی کے ذریعے سمجھنے اور سمجھانے کی کاوش کی گئی ہے۔ ناول نگار کا قلم معاشرے کا گہرائی اور گیرائی سے مشاہدہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں پختہ تجزیہ قارئین کے لیے فکر کی نئی راہیں وا کر دیتا ہے۔ جب ہم عصری مسائل کی بات کرتے ہیں تو اس میں جاگیر دارانہ نظام اور نام نہاد پیری مریدی نظام سے بھی بڑھ کر کچھ اور مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جن میں عدم برداشت آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ سیاسی نظام کے عدم تسلسل نے بھی اخلاقی و سماجی قدروں کو شدید نقصان سے دوچار کیا ہے۔ آمریت نے پاکستانی معاشرے میں کئی ایک مصیبتوں کے در وا کیے ہیں۔ جمہوریت کے عدم تسلسل کی وجہ سے بھی منافقت کے رویے پروان چڑھے ہیں۔

جہالت، بدعنوانی، جنس پرستی، طاہر اور باطن کا فرق، مذہب کی غلط تفہیم، خود غرضی، لالچ، حسد، ہوس، نمود و نمائش، ایک دوسرے کو سمجھنے کے بجائے اپنا نظریہ زبردستی مسلط کرنے کا رویہ، شدت پسندی اور انتہا پسندی کی وجہ سے معاشرہ مضبوط بنیادوں پر استوار نہیں ہو پایا بلکہ اس میں ہر گزرتے دن کے ساتھ بگاڑ بڑھتا جا رہا ہے۔

مجموعی طور پر "کُہر" اور "حبس" دونوں اس سماج کی حقیقی پیش کش اور اس کی درست تفہیم کے پیش نظر مصنف کے سماجی شعور کے آئینہ دار ہیں۔ جن میں مصنف نے سماجی برائیوں کو اجاگر کرتے ہوئے سماجی اقدار کی پیشکش کو بھی مسلسل اپنائے رکھا۔ یعنی یہ سماج کی تنقید و تعمیر دونوں کا بہترین موقع ہے۔ یوں اپنے عصر سے مکمل طور پر پیوست اور حقیقی ناول ہیں۔

"کُہر" تمام مسائل کو ایک وسیع کینوس میں دکھاتا ہے۔ جس میں خارجی پہلو مفصل ہے اور داخلی حوالہ اپنی مکمل ارتقائی صورت میں نہیں ملتا۔ جب کہ "حبس" میں خارجی عوامل کے تحت خارج میں ہونے والی داخلی تبدیلیوں کو اور اس کے اندر پیدا ہونے والی اخلاقی برائیوں کو زیادہ گہرائی سے پیش کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر دونوں ناول اپنے عہد کے مکمل عکاس ہیں اور ان میں سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ سماجی اقدار کی پیشکش، سماجی مسائل اور اس کے حل دونوں کو ایک ساتھ دکھاتی ہے۔ جس سے مصنف کی عصری مسائل سے آگاہی اور ان کے سماجی شعور کی مکمل تصویر قاری کے سامنے ابھرتی ہے۔

ج۔ سفارشات

تحقیق اور مجموعی جائزے کے بعد مندرجہ ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ مقالے میں تحقیق کا دائرہ محمد الیاس کے ناولوں میں سماجی شعور اور عصری مسائل تک محدود تھا۔ نئے محققین اس کے دائرے میں مزید توسیع کر سکتے ہیں۔

۲۔ محمد الیاس کے ناولوں میں اقدار کی شکست وریخت کے تناظر میں تحقیق کی جاسکتی ہے۔

۳۔ محمد الیاس کے ناولوں میں جنس نگاری کے حوالے سے کام کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ ان کے ناولوں میں دیہی زندگی کے مسائل کی عکاسی کے پہلو پر آئندہ لکھے جانے والے مقالہ جات میں تحقیق کی جاسکتی ہے۔

۵۔ محمد الیاس کے ناولوں کے باغی کردار تحقیق کے لیے عمدہ موضوع ہو گا۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

۱۔ محمد الیاس، حبس، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

۲۔ محمد الیاس، کُہر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

ثانوی ماخذ

۱۔ آل احمد سرور، بحوالہ اردو نثر کا فنی ارتقا، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ء

۲۔ آمنہ صدیقی، افکار عبدالحق، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، اگست ۱۹۶۲ء

۳۔ ابنِ خلدون، مقدمہ ابنِ خلدون، ترجمہ مولانا راغب رحمانی، نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی، حصہ اول، ۲۰۰۱ء

۴۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی (مرتب)، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

۵۔ احتشام حسین، تنقید اور عملی تنقید، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۴ء

۶۔ احسن فاروقی و ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ناول کیا ہے، درد اکادمی لاہور، ۱۹۶۴ء

۷۔ امجد علی شاکر، پروفیسر، اردو ادب تاریخ و تنقید، عزیز پبلیشرز لاہور، ۲۰۱۳

۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، اختلافات، مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۷۵ء

۹۔ بازغہ قندیل، اردو ناول میں زوالِ فطرتِ انسانی کی تمثیلات، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء

۱۰۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

۱۱۔ حسن عسکری، انسان اور آدمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۴ء

۱۲۔ خاقان ساجد، بحوالہ مور پنکھ پہ لکھی آنکھیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء

۱۳۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۰۵ء

۱۴۔ خدیجہ مستور، آنگن، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء

۱۵۔ خورشید اسلام، تنقیدیں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۷ء

۱۶۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادبِ اردو، مترجم مرزا محمد عسکری، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ء

۱۷۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، عبداللہ ہارون روڈ کراچی، آٹھویں بار ۱۹۸۹ء

۱۸۔ سپنسر بحوالہ شعیب عتیق خان، ڈاکٹر، اردو کے افسانوی ادب پر فسادات ۱۹۴۷ کے بعد، بیکن بک ہاؤس لاہور، ۲۰۱۴ء

۱۹۔ سحر انصاری، "پاکستانی معاشرہ اور ادب" مترجمین ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری، احمد سلیم، پاکستان سٹڈی سنٹر جامعہ کراچی، ۱۹۸۷ء

۲۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر داستان اور ناول (تنقیدی مطالعہ)، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۳ء

۲۱۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو ناول نگاری، الحمر پبلیشرز دہلی، ۱۹۷۲ء

۲۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سر سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۵ء

۲۳۔ صالحہ زریں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک، ادارہ نیا سفر، ۲۸ مرزا غالب روڈ، الہٰ آباد، ۲۰۰۰ء

۲۴۔ طیبہ خاتون، ڈاکٹر، اردو نثر کی داستان، یمانی پرنٹرز لاہور، ستمبر ۲۰۰۳ء

۲۵۔ عرفان جاوید، مُورتیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء

۲۶۔ علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۹۷ء

۲۶۔ علی عباس جلالپوری، رسوم اقوام، تخلیقات، لاہور، ۱۰ اگست ۲۰۰۰

۲۷۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۹ء

۲۸۔ محمد الیاس، بارش، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء

۲۹۔ محمد الیاس، برف، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

۳۰۔ محمد الیاس، پُروا، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء

۳۱۔ محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

۳۲۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ادبی تنقید، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء

۳۳۔ محمد حسن، ادبی سماجیات، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۱ء

۳۴۔ مشتاق احمد یوسفی، آبِ گُم، مکتبہ دانیال، کراچی، اشاعتِ اول، فروری ۱۹۹۰ء

۳۶۔ مہر اختر وہاب، اردو میں اسلامی ادب کی تحریک، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

۳۷۔ ناصر کاظمی، دیوان، اسلام پورہ لاہور، ۱۹۸۱ء

۳۸۔ نگینہ جبیں، اودو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ، ۱۹۴۷ اور اس کے بعد، ایجوکیشنل بُک ہاؤس علی گڑھ، طبع اول ۲۰۰۲ء

۳۹۔ یوسف حسین سر مست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ترقی اردو دہلی، ۱۹۹۵ء

رسائل

۱۔ ایوانِ اردو دہلی، جلد نمبر ۳۲، شمارہ نمبر ۵، ستمبر ۲۰۱۸ء

۲۔ جان گُل، سماجی علوم کی روشنی میں تفسیر القرآن کی ضرورت واہمیت، مشمولہ: "ہزارہ اسلامیکس" جنوری تا جون ۲۰۱۹ء، جلد ۸، شمارہ ۱

۳۔ جمیل حیات، ڈاکٹر، حبس: ناسٹلجیائی کرب کا اظہاریہ، مشمولہ: سہ ماہی دھنک رنگ، فتح جنگ، ۲۰۲۰ء

۴۔ جمیل حیات، ڈاکٹر، کُہر: جمال پرستوں کے اُجڑے خوابوں کی داستان، مشمولہ: تسطیر ۴، جہلم

۵۔ جمیل حیات، ڈاکٹر، محمد الیاس کے ناولوں میں مزاحمت کے جلوہ ہائے رنگ، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، شمارہ نمبر ۱۲۴، ۱۲۳، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۲۰۲۰ء

۶۔ روبینہ الماس، عبداللہ حسین کے ناولوں میں طبقاتی شعور، مشمولہ: بنیاد جلد ۷، ۲۰۱۶ء

۷۔ روبینہ کوثر، ظفر ہرل، ڈاکٹر، آنگن کی فکری ساخت: موضوعاتی مطالعہ مشمولہ: زبان وادب (شمارہ ۶۰۰)، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونی دوسٹی، فیصل آباد

۸۔ سمیرا عمر، محمد الیاس کے ناولوں میں شدت پسندی کی پیشکش، مشمولہ: دریافت، شمارہ ۲۱، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

۹۔ سید مسعود اعجاز بخاری، تبصرہ، مشمولہ: تجدید نو، مارچ ۱۹۹۵ء، لاہور

۱۰۔ فردوس احمد بٹ، ڈاکٹر، جمیلہ ہاشمی کے تاریخی ناول، اردو ریسرچ جرنل، شمارہ ۱۳، جنوری تا مارچ ۲۰۱۸ء

۱۱۔ محمد سلیم الرحمٰن، آنسوؤں کی جھڑی، مشمولہ: ہفت روزہ شہری، اپریل تا مئی ۲۰۱۴ء، لاہور

۱۲۔ منشایاد، کُہر پر ایک نظر، مشمولہ: سہ ماہی آبشار، ناول صدی نمبر، میانوالی، ۲۰۱۶ء

لغات

۱۔ آکسفورڈ ایڈوانس لرنر لغت، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۴ء

۲۔ الحاج مولوی فیروزالدین، فیروز الغات اردو، فیروز سنز پرائیویٹ لاہور، باراول ۲۰۱۰

۳۔ انگریزی آکسفورڈ لیونگ لغت، ۱۲ اپریل ۲۰۲۰ء

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، اسلام آباد، ۱۶ مئی ۱۹۹۴ء

۵۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، اپر مال لاہور، جلد سوم و چہارم
۶۔ وارث سرہندی، علمی اردو جامع لغت، علمی کتاب خانہ کبیر سٹریٹ لاہور، ۱۹۷۹ء

انٹرویو

محمد الیاس، ٹیلیفونک انٹرویو، راولپنڈی، ۱۳ دسمبر ۲۰۲۰ء

محمد الیاس، بالمشافہ انٹرویو، راولپنڈی، ۱۰ جون ۲۰۲۰ء

انگریزی کتب

Charles H. Colley , Social Consciousness Published: American Journal of Sociology,Volume, 12 issue 5, March, 1907, P 676

J. M. Bochenski,sovietica, d. Reidel publishing company / dordrecht – holland,1958,p55

Krech, Crutchfield, Ballachey, Individual in Society, Tokyo: Kogakusha Company, Ltd, 1962

Robin M. Williams, JR," Individual and Group Values", Social Psychology: Reading and Perspective, Edited by Edgar F. Borgata, Chicago: Rand McNally and Company, 1969

Spencer, Herbert, The principles of Sociology, Vol,6, Appleton.7, 1985

Stanislaw ossowski, classstructure in the socialconsciousness, routledge,11 new fetter lane, london,1963,p-6

The social science encyclopedia edited by Adam kuper and Jessica kuper , S5 services book club 1989

Urdu Scholars ki Duniya, Vol 1, Issue111, October 2013

ضمیمہ

بالمشافہ انٹرویو ۱۰ جون ۲۰۲۰ء

آپ کے متعدد افسانوی مجموعے اور ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے۔ لیکن ناولوں میں سماجی مسائل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس کی کیا خاص وجہ ہے؟

افسانے میں کوئی ایک مسئلہ اجاگر کیا جاسکتا ہے وہ بھی اختصار کے ساتھ۔ اس صنفِ ادب کا حُسن ہی یہ ہے کہ بات رمز و کنائے میں کی جائے۔ توجہ وحدت تاثر اور وحدتِ خیال پر مرکوز رہے۔ جبکہ ناول کے وسیع کینوس میں پوری دنیا سمائی جاسکتی ہے۔ فردِ واحد کی پوری یا زندگی کے کسی ایک دورانیے کی کہانی، کسی خاندان، گروہ، بستی یا پوری قوم کے حالات و واقعات اور مسائل، بشمول اس سے متعلقہ پورے یا ایک خاص دور کی بھرپور عکاسی تمام تر جزئیات متعلقہ تفصیلات اور ضمنی واقعات کی عکاسی کی جاتی ہے، تاکہ قاری کو کسی قسم کی تشنگی محسوس نہ ہو۔ ناول کا دامن جادو نگری کی مانند پُر اسرار اور لا محدود ہے۔ اس میں علمی، ادبی، روحانی، تاریخی، طلسماتی اور مذہبی گویا ہر موضوع کو سمویا جاسکتا ہے۔ صرف بنی آدم ہی نہیں کرہ ارض پر بسنے والی دیگر مخلوقات جمادات، نباتات اور مظاہرِ قدرت کو بھی موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خدا و دیگر کسی سیارے اور مافوق الفطرت کرداروں پر بھی خامہ فرسائی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ ناول نگار کا تجزیہ، مشاہدہ، مطالعہ تخئیل کی پرواز اور تخلیقی صلاحیت اس کی متحمل اور وسیع ہو۔

آپ کی ادبی سرگرمیاں کیا کیا ہیں؟

میں گوشہ نشین تنہائی پسند ادیب ہوں۔ ادبی سماجیات کو سمجھ ہی نہیں سکا۔ صرف اپنے تخلیقی کام پر توجہ مرکوز ہے۔ بیس تصنیفات میں سے ایک پر بھی کسی " سکہ بند نامور " شخصیت سے حرفِ شپاس نہیں لکھوایا۔ مجھے تقریبِ رونمائی منعقد کرانے اور سٹیج پر چڑھ بیٹھنے کا شوق ہے نہ کبھی پرائی شادی میں ناچنے گانے کا جوش سوار ہوا۔ البتہ کسی ہم خیال کی خوشی میں شریک ہو بھی جاؤں تو پچھلی نشستوں میں کہیں بیٹھا رہتا ہوں۔ کسی انجمن ستائشِ باہمی کا کارکن نہیں۔ صرف اپنی تخلیقات کی وساطت سے براہِ راست قارئین سے تعلق رکھنے کا قائل

ہوں۔ گویا لکھنے پڑھنے کے سوا اور کوئی سرگرمی نہیں۔ تاہم ذہنی تھکن اتارنے کے لیے گھر کے کام کاج میں زوجہ محترمہ کا ہاتھ بٹانا اچھا لگتا ہے۔

زوجہ کا تذکرہ آ گیا والدین کے بارے میں کچھ ذکر کریں کہ آپ کی تربیت یقیناً ان کی بدولت ہے۔

میرے والد بہت خوبصورت اور محبت کرنے والی شخصیت تھے۔ اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن بہت یاد آتے ہیں۔ میری والدہ نہایت نرم دل، صابر شاکر اور محبت کرنے والی ذہین خاتون تھیں۔ ان کے معمولات میں باقائدگی سے نماز ادا کرنا اور بلاناغہ تلاوت قرآن پاک شامل تھی۔

افسانوی ادب کی طرف رجحان کا بنیادی محرک کیا ہے؟

میں سمجھتا ہوں بچپن میں والدہ کی شخصیت نے متاثر نے کیا۔ اگر میری والدہ نے روایتی نصابی تعلیم حاصل کی ہوتی اور حالات انہیں مطالعہ کرنے کی مہلت دیتے تو آج ادب میں ان کا بڑا مقام ہوتا۔ قدرت نے انہیں داستان گوئی کا سلیقہ عطا کیا تھا لوک گیت کی تہہ میں نازک خیال کو خوب سمجھتی تھیں۔

ٹیلی فونک انٹرویو ۱۳ دسمبر ۲۰۲۰ء

اپنی ناول نگاری کے بارے میں زاویہ نگاہ کیا ہے؟

زاویہ نگاہ ایک ہی ہے کہ انسانی معاشرے میں پائے جانے والے ظلم، جبر، منافقت، جھوٹ، استحصال، بدعنوانی اور طرح طرح کے تعصبات کی نشان دہی کروں۔ میں بطور ادیب ہر مظلوم اور زیر دست کے ساتھ ہوں۔

ناول اور افسانوں کے موضوعات کہاں سے اخذ کرتے ہیں؟ فکری ماخذ کیا ہے؟

سماجی صورتحال، ماحول، ذہنی کیفیت اور پھر معاشرے کے مختلف کرداروں کی زندگی کی صورتحال ہی سے موضوع بنتا ہوں۔

آپ کے ناولوں کے موضوعات میں مماثلتیں کافی ہیں؟

ظاہر کے ہمارے معاشرے میں سماجی صورتحال میں خاطر خواہ انقلاب یا ارتقاء نہیں ہوا کہ کرداروں کی سماجی حیثیت یکسر بدل گئی ہو۔ سو جیسا سماج کو دیکھتا ہوں اسی کی ادبی پیشکش کرتا ہوں۔

مثلاً آپ نے عورتوں کے حوالے سے جو کچھ لکھا ان کے حقوق کے حوالے سے اس رائے کا اطلاق کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟

ہمارے معاشرے میں عورتوں کے حقوق کی کیا بات کی جائے۔ عورت اپنی رضا سے جس مرد کے پاس سونا چاہتی اسے غیرت کا مسئلہ بنا دیا جاتا ہے اور اسی عورت کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے سرپرستوں کے منتخب کیے ہوئے مرد کے ساتھ سوئے یہ غیرت کا معاملہ ہے یا پہلے والا تھا۔

افسانوی ادب میں مزید آپ کی کون کونسی کتابیں شائع ہو رہی ہیں؟

اسی سال کے اختتام تک ۲۷۵ صفحات پر مشتمل میرا ناولٹ "رنگ ریز" منظرِ عام پر آجائے گا۔

اکیسویں صدی میں ناول کا مستقبل کیسا دیکھتے ہیں؟

اس سوال کا جواب کوئی محقق اور نقاد ہی دے گا۔ میں بطور ادیب اپنا فریضہ حتی المقدور ادا کر رہا ہوں۔ مستقبل جو بھی ہو، مجھے انسان کے احساسات، جزبات، حقوق، فرائض، خوشیاں، غم اور مسائل لکھنے ہیں۔ معاشرے کی عکاسی دیانتداری سے کرنی ہے۔ ظالم اور مظلوم کا فرق بتانا ہے۔

"کہر" سے "حبس" تک کے ارتقائی سفر کو بیان کریں۔

شدتِ احساس کے زیرِ اثر جو کردار اور واقعات حواس پر سوار ہوئے وہ مرحلہ وار لکھتا گیا۔ میری عمر سیکھنے والی تو ہے نہیں۔ زندگی میں کئی پیشے اختیار کیے۔ ہر طبقے کے لوگوں سے واسطہ رہا۔ تخلیقی صلاحیت قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی، جس کے تحت مشاہدات کی بنا پر لکھتا چلا جا رہا ہوں۔ یہ تو میرے ژرف نگاہ قارئین ہی بتا سکتے

ہیں کہ میرے فن نے ارتقائی مراحل طے کیے یا انحطاط پذیر ہے۔ تاہم میں مطمئن ہوں کہ جو پیغام دینا چاہا، اس میں کامیاب رہا اور قارئین کی محبت بھی فرواں ہوئی۔ میں نے کبھی پرواہ نہیں کی کہ ادبی سنگھاسن پر براجمان کوئی خود ساختہ دیوتا میرے بارے میں کیا رائے دے گا۔